پرِ ہوا کے   پرِ ہوا کے   پرِ ہوا کے

پرِ ہوا کے

شعری مجموعہ

انور سلیم

پرِ ہوا کے   پرِ ہوا کے   پرِ ہوا کے

مکان نمبر ج/۸/۸/۲۶/۳۷۵.۱.۱۷ سنتوش نگر حیدر آباد ۵۰۰۰۵۹

PAR HAWA KE
(POETRY)
BY
ANWAR SALEEM
RS. 175/-

اس مجموعہ کی اشاعت میں
اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی جزوی مالی اعانت بھی شامل ہے

پَرہوا کے

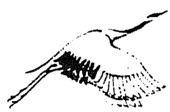
انور سلیم

ناشر

SHAHID PUBLICATIONS

شاہد پبلی کیشنز دریا گنج نئی دہلی

☆ کتاب کا نام : پر ہوا کے
☆ مصنف : انور سلیم
☆ اشاعت : ۲۰۰۰ء
☆ قیمت : ۱۷۵ ایک سو پچھتر روپے
☆ کتابت : محمد ہارون بھرتپوری
☆ سرورق : انور سلیم
☆ طباعت : ایلائڈ ٹریڈرس نئی دہلی
✪ زیر اہتمام ☜ ڈاکٹر شاہد حسین



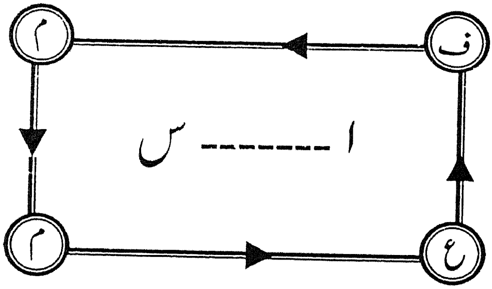
ملنے کے پتے :

✦ ۱ انور سلیم مکان نمبر ۱۷-۱-۳۷۵/۲۶/A/۸/C
سنتوش نگر حیدر آباد - ۵۰۰۰۵۹
✦ ۲- شاہد پبلی کیشنز ۲۲۵۳ گلی ریشم والی کوچہ چیلان۔
دریا گنج نئی دہلی ۲- فون نمبر ۳۲۵۸۳۰۹
✦ ۳- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶-
✦ ۴- ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس- گولا مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲-

انتساب

اُس دائرہ کے نام
جو ان گنت دائروں پر
محیط ہے۔

انور سلیم



☆ ابتدا، عبد علی کے ساتھ۔

☆ اڑان بھری اودے پور (راجستھان) کے احباب کے ساتھ۔

☆ روح بنی اہلیہ۔

☆ حیدرآباد میں دوست احباب کا تقاضا ایک مدت سے... مگر...

☆ فاروق شکیل کا اصرار کامیاب... پھر...

☆ ایک مصروف ترین شخصیت م، ق، سلیم... جس نے اپنا قیمتی وقت مسودہ تیار کرنے میں صرف کیا... اب...

☆ جب کہ یہ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے، اس کا سہرا مظہر الزماں خاں کے سر... اور...

☆ اب پلٹ کر دیکھتا ہوں تو عبد علی ہی سامنے ہے۔

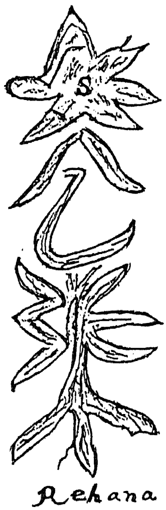
ترتیب

لکیریں

صفحہ نمبر

لکیریں

زاویوں کی





"پر ہوا کے" ایک تاثر

پروفیسر مغنی تبسم

انور سلیم راجستھان کے شہر اودے پور میں پیدا ہوئے۔ یہ سرزمین موسیقی، آرٹ اور ادب کا زرخیز خطہ ہے۔ اس مٹی کی سُگندھ انور سلیم کی شاعری میں رچی بسی ہے۔ انور سلیم نے تلاش معاش میں اپنے آبائی وطن سے نکل کر جہاں گردی اختیار کی۔ خلیجی ممالک گئے، ایک عرصہ تنزانیہ میں گزارا۔ اب حیدر آباد کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔ جہاں گردی کے تمام عرصے میں وہ اپنے مشاہدوں اور تجربوں کو شعر کا پیکر دیتے رہے۔ انھوں نے نہ تو اردو کی کلاسیکی شعری روایت سے زیادہ سروکار رکھا نہ ہی جدید اور جدید تر رجحانات سے متاثر ہوئے۔ تجربات اور مشاہدات کے نتائج میں اگر ماضی اور ہم عصر فکر سے کہیں مماثلت نظر آتی ہے تو اس کا سبب تقلید نہیں ہے۔ عدم، لا اور مایا کے تصورات جو تصوف اور ویدانت کی راہ سے ہماری شاعری میں در آئے ہیں ان میں شعرائے نے بڑی موشگافیاں کی ہیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مضامین انھوں نے رسمی انداز میں نہیں باندھے بلکہ اس میں ان کے مشاہدے، تجربے اور احساس کی توثیق و گواہی شامل ہے۔ میر نے کہا تھا:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

غالب　:　ہستی عدم ہے آئینہ گر روبہ رو نہ ہو

فانی　　فانی وہ میں ہوں نقطۂ موہوم اتصال
جس میں عدم کی دونوں حدیں ہیں ملی ہوئی

کلاسیکی غزل میں ہستی کی بے ثباتی اور بے حقیقی کو حباب، سراب، عکس، سایہ وغیرہ استعاروں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ن۔م۔ راشد نے انسان کو "لا" کے مساوی قرار دیا۔ انور سلیم نے اس کے لیے "صفر" کی اصطلاح وضع کی ہے۔ صفر کا یہ تصوّر مابعدالطبیعاتی، صوفیانہ یا ویدانتی نہیں بلکہ طبعی، دنیوی اور ارضی ہے۔ اس تصور میں زندگی کی لایعنیت کا احساس بھی شامل ہے۔

انور سلیم کے زیرِ طبع مجموعۂ کلام "پرِ ہوا کے" میں "خالی لکیریں" کے باب میں کئی نظمیں شامل ہیں جو صفر کے تصور سے وابستہ ہیں۔ صفر ہستی، صفر میں، صفر شعور، صفر رشتہ اور صفر معاملہ وغیرہ۔ اس سلسلے سے ہٹ کر انور سلیم نے جو نظمیں لکھی ہیں ان کے موضوعات متنوع ہیں۔ ان میں شخصی واردات جذبات، احساسات کی ترجمانی بھی ہے اور عالمی پس منظر میں عصری مسائل کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ اب کسی اور ساگر کی مچھ کو نہیں جستجو، خودکشی، کالے لوگوں کا شہر، آخری جائزہ اس سفر کا، اس مجموعے کی چند نمائندہ موثر اور کامیاب نظمیں ہیں۔

انور سلیم کی غزل جدید تر غزلیہ شاعری کا شناخت نامہ ہے۔ ان کی غزلوں کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ دو دہائیوں میں غزل کے تیور بدل گئے ہیں۔ تبدیلی زبان میں بھی آئی ہے اور طرزِ احساس میں بھی۔ ان تبدیلیوں کے باوجود اچھے غزل گو شاعروں نے غزل کے مزاج اور تقاضوں کی پاسداری کی ہے۔ انور سلیم کو غزل کے فن پر دست رس حاصل ہے۔ تہہ داری اور معنی آفرینی روایتی غزل کا وصف ہے انور سلیم کی غزلیہ شاعری میں بھی یہ وصف نمایاں ہے لیکن اس کے لیے انھوں نے نئے پیرائے وضع کیے ہیں۔

انور سلیم کی غزلیہ شاعری میں جہاں عصری زندگی کے مسائل کا عکس جھلکتا ہے وہیں خارجی حالات سے نبرد آزما انسان کی داخلی کشاکش کا منظر بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ذیل کے چند منتخب اشعار سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کشتی کو بھروسے پہ ہوا کے میں بہاؤں   گم نام سمندر کے مزے لوٹ کے آؤں
شفاف نظر آنے لگے آنکھ کے شیشے   جی چاہے ذرا آج یہاں گرد اڑاؤں

کب سے دریا خشک پڑا ہے پھر بھی ضد یہ دیکھو
جال بچھائے آس لگائے بیٹھے روز مچھیرا
جانے کس ناگن کی کھوج میں نکلا تھا وہ گھر سے
جنگل جنگل گھوم کے بھی ہے خالی ہاتھ سپیرا

دودھ آج کل پلا رہا ہوں میں   جانتا ہوں خصلتیں بھی ناگ کی

'شب جنگل' میں رہ کر اپنی آنکھیں کیوں چمکاتے ہو
سورج سے بھی آنکھ ملاؤ تو میں جانوں ہو بے باک
اک بادل ہے جس کے قبضے میں ہے دھرتی کی دولت
اور اک صحرا، ریت، بگولے، پیاس فقط اس کی املاک

صدف صورت نظر آتے ہیں چہرے تو بہت لیکن
نہیں معلوم کہ ان مول موتی کس میں پنہاں ہے

بھولی بسری یادوں کے آنگن میں پاؤں رکھتے ہی
تیری صورت بکھرے موتی اک دھاگے میں پروتی ہے

روح کی تسکین ہو یا جان کا آزار ہو　بند مٹھی میں نہ جانے پھول ہو یا خار ہو
سایۂ دیوار ہے لیکن نہ ٹھہروں گا یہاں　کیا بھروسا یہ بھی کوئی ریت کی دیوار ہو

چھپی ہیں کرچیاں بھی کانچ کے کھلونے میں　یہ سوچ کر ہی اسے رکھ دیا ہے کونے میں
ہوا چلے گی تو ہر سمت پھیل جاؤں گا　اگرچہ ڈھیر ہوں مٹی کا ایک کونے میں

پی لیے میں نے سمندر کتنے　پھر بھی صحرا مرے اندر کتنے

سمجھتے تھے جسے سب کا مسیحا　یہی وہ شخص ہے جو دار پر ہے

لوگوں کا سیلاب ہے لیکن جان نہیں ہے شہروں میں
کہنے کو سب ساتھ ہیں لیکن پھر بھی کوئی ساتھ کہاں
سوچ کے اولے گرتے ہیں اور سر کی نس نس پھٹتی ہے
کیسا موسم آیا ہے ہر سانس کی طاقت گھٹتی ہے

مجھے یقین ہے کہ انور سلیم کا مجموعۂ کلام صاحبِ ذوق قارئین اور اہلِ نظر نقادوں کی توجہ کا مرکز بنے گا اور یہ بھی کہ اس کی اشاعت کے بعد خود انور سلیم اپنے شعری سفر میں نئی منزلوں کی کھوج میں نکل پڑیں گے۔

مغنی تبسم

۲۵-۱۰-۲۰۰۰

(پروفیسر مغنی تبسم)

*

"ہوا کے پروں سے صفر کے موہوم دائرے تک"

ڈاکٹر ظلِّ ہما

انور سلیم کے مجموعہ کی سبز ذہن پر کئی لکیریں بنا دیتی ہے۔ یہ لکیریں یہ کہیے کہ سوالیہ نشان ہیں۔ آج کی زندگی آج کے ذہن اور ان دونوں کو پیش کرنے والی آج کی زبان کے نشان۔ فن کسی بھی صورت میں ہو رقص کی شکل میں موسیقی کی صورت میں تعمیر کی ہیئت میں ایک خواب کی تعبیر بھی ہوتی ہے اور ایک نئے خواب کا ہیولا بھی۔ یہ لکیریں اسی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کہ انور سلیم نے اپنے شعور کی آنکھوں سے کن کن چیزوں کو دیکھا ان سے تاثر قبول کیا تصورات کے سانچوں میں ڈھالا اور پھر اس کی کچھ تصویریں صفحۂ قرطاس پر آ گئیں۔

سب سے پہلے اس شعری تخلیق کا نام متاثر کرتا ہے "پرِ ہوا کے" ہوا کا رشتہ آواز سے بھی ہے ساز سے بھی اور پرواز سے بھی۔ جب اس موضوع پر سوچنے کا موقعہ ملتا ہے تو ہوا کے پروں کے معنی اور معنویت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے اور یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہوا انور سلیم کے یہاں ایک تحرک اور تسلسل کا نام بھی ہے اور نئی رسائیوں اور پہنائیوں تک پہنچنے کی خواہش بھی۔ ان کو یہ علامت اور اشاراتی لکیریں اتنی عزیز کیوں ہیں اس کی وجہ ان کی سوچ بھی ہے۔ اور ان کا وہ مشاہدہ بھی جو ان کی زندگی میں بچپن سے جوانی اور عالمِ شباب سے اس دورِ زندگی تک

وابستگی رکھتا ہے جس سے وہ گزر رہے ہیں۔

ان کی نظموں میں دو علامتیں یا اشاراتی لکیریں خاص طور پر ابھرتی ہیں ایک دور تک پھیلا ہوا صحرا۔ ریت کی سطح پر بہتی ہوئی لہریں اور دوسرے ایک فکری تشنگی جو ان کو برابر ریت کی لہروں کی طرح بہائے لیے جاتی ہے اب یہ ایک عجیب اتفاق ہے اور ایک فنکار کے ذہن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ وہ راجستھان میں پیدا ہوئے وہیں پلے بڑھے خلیجی ممالک میں بسلسلۂ ملازمت رہے جو کچھ آنکھوں سے دیکھا اور ذہن سے سوچا اسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا۔ اسی لیے صحرا اس کی پہنائی و تنہائی ان کے شعور و شعر کو سمجھنے کے لیے معنی آفریں علامتوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسے نظم میں بھی دیکھا جا سکتا ہے نظم کے مختصر ترین تجربوں میں بھی اور ان کی غزلوں میں بھی۔

ان کی نظمیہ شاعری ذہنی تجربوں کا درجہ رکھتی ہے اس کو وہ نئی علامتوں کے ذریعہ خود سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے دل کی گہرائیوں اور پہنائیوں میں بار بار یہ محسوس کیا ہے اور اس کو لکھا بھی ہے کہ ان کے خیالات نئے سوالات کو جنم دے رہے ہیں۔ یہ زندگی کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور کیا نہیں ہے؟ اس پر ہمارے یہاں لکھا بھی گیا ہے سوچا بھی گیا ہے زندگی کو سراب اور حباب دو بڑی علامتوں میں قید بھی کیا گیا ہے۔ سلیم انور نے اُسے "صفر" میں قید کرنے کی کوشش کی ہے ہوا کے پروں سے صفر کے موہوم دائرے تک کتنے فاصلے ہیں جو آسمان کی وسعتوں کی طرح دور تا دور پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں اور پھر ایک پرچھائی کی طرح سمٹ جاتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو خیال و حال کا یہ بدلتا ہوا منظر نامہ جہاں لفظ و معنی سے ہم رشتگی کے باوجود صحراؤں کی فضا اور اس ماحول سے زیادہ نسبت رکھتا ہے جہاں زندگی کی ہر شے اور ذہن کا ہر تمثیلی پیکر لمحہ بہ لمحہ اپنی ہئیت اپنی حد بندیوں اپنی تمثال اور معنی کو بدل دیتے ہیں۔ ابھی ریت کے تودے ہیں جو ہواؤں کے سہارے بنتے ہیں۔ اپنی موجودگی اور ہوا کے تشکیلی کارناموں کا احساس دلاتے ہیں اور پھر اسی ہوا کے ساتھ تحلیل ہو جاتے

ہیں۔ اور گرد کے ذرات میں بدل جاتے ہیں۔

الغرض نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

یہی بنتی بگڑتی لکیریں ہیں سوال کرتی ہوئی علامتیں ہیں اور صفر کی لافانیت کا تصور دلاتے ہوئے منظر نامے ہیں۔

ان اشعار میں ردیف وقوافی اور بحر و وزن کی پابندیوں کو تلاش نہ کیجئے خیالات کی روانی اور رقصانی کو ہواؤں کے پروں کی جنبشوں میں محسوس کیجئے تو ہم انور سلیم ان کے ادبی شعور اور شعری احساس سے کچھ زیادہ قریب آسکیں گے۔ ان کی شاعری کا یہ حصہ ایک نئے زاویۂ نظر سے ان کی ادبی کاوشوں کو پرکھنے کی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔

ان کی غزلیہ شاعری بھی اپنے بہاؤ میں نئے شعور کی رو سے زیادہ قریب آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ سرتاسر صرف شعور نہیں ہے بلکہ ادبی شعور کی حسیاتی لہریں ہیں۔ ان میں نغمہ بھی ہے وہ نغمہ جو نئے کا پابند ہے غزل میں ردیف وقافیہ کا التزام اپنے معنی اور شعری معنویت کے ساتھ موجود ہے لیکن قابل توجہ امر ان کی فکر کے وہ پہلو ہیں جن میں نیا پن ہے۔ زاویۂ نگاہ کی طرفگی ہے اور احساس کی وہ شدت جو جذبہ کی صداقت کو اپنے اندر سمیٹتی اور خوشبو کی طرح اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔

اس ضمن میں عبد علی صاحب کی خاموش معاونت بھی چاہے لائق دید نہ ہو، قابلِ داد ضرور ہے کہ ان کی خاموش و پر خلوص شخصیت کا ہاتھ ہوا کے پر ہی کی طرح ان دیکھے انداز سے کام کر رہا ہے۔ وہ کویت میں قیام پزیر ہیں۔ اس چھوٹی سی ریاست میں جہاں دولت کی فراوانی بھی ہے اور اپنے من میں سمٹ کر سوچنے اور سوچ میں ڈوب جانے کی ایک خاموش دعوت بھی۔ انور سلیم کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت عبد علی صاحب کی خاموش شخصیت کا احساس بھی ایک روشن پرچھائی کی طرح ہوتا رہتا ہے۔

ظلِ ہما

ہاں! تو سنئے

مضطر مجاز

ہیگل نے کسب فن کے تین مراحل بتائے ہیں. یعنی Grasping (1) owning (
(3) Developing

اسے مختصراً God فارمولہ بھی کہا جا سکتا ہے. اردو تعلیم اور نتیجتاً اردو تہذیب کے زوال کے بعد اب صورت حال یہ ہے کہ جس کسی فرد فرید کو اردو لکھنا یا پڑھنا آتا ہے وہ ضرور بالضرور شعر گوئی کی طرف راغب ہوتا ہے. غالباً اس کے دو اسباب ہیں. (۱) مشاعروں کی گرم بازاری اور (۲) سستے قسم کے نیم ادبی، نیم فلمی اور نیم سماجی اردو جرائد کا اجرا، بلکہ مشروم گروتھ! مشاعروں میں جہاں عام طور پر پست درجے کے سوقیانہ اشعار پر داد ملتی ہے، واہ واہ کے ڈونگرے وصول کرنے کا شوق اور جرائد کو اپنی شکم پری کے لیے ہر قسم کے کلام کی اشاعت کی مجبوری. ان دو وجوہات سے سستی قسم کی غزل گوئی کو اردو میں بڑا فروغ حاصل ہوا ہے. کسب فن اور حصول علم (Grasping) اب ایک کار فضول ہے. جب یہی نہیں تو owning اور Developing کے مراحل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. اس الم ناک اور روح فرسا ماحول میں جب ہم انور سلیم جیسے شاعر کی آواز سنتے ہیں تو چونکے بغیر نہیں رہ سکتے. انور سلیم کی یہ منفرد آواز اس سبب سے بھی ہے کہ انھوں نے نہ مشاعروں سے سروکار رکھا ہے نہ رسالوں میں بکثرت چھپنے چھپانے سے، نہ مشاعروں کی طرحیں انھیں لکھنے پر مجبور کرتی ہیں نہ مدیران جرائد کے مطالبے.

وہ تو شعر صرف اسی وقت کہتے ہیں جب ان کی طبیعت اندر سے انھیں شعر کہنے پر مجبور کرتی ہے:

شعر خود کردہ تقاضائے کہ گردو فن ما

ان کی شاعری کو پڑھ کر ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ غزل کی شاعری میں ایسی تازگی ایک ناممکن سی بات ہے۔ نہ صرف معنوی اعتبار سے بلکہ لفظیات میں بھی انور سلیم کا شعر فی زمانہ دور دور تک پھیلے ہوئے لق و دق خارستان میں ایک پھولوں بھرا شجر نو دمیدہ ہے۔ انور سلیم نے قدیم ہو کہ جدید ہر قسم کے کلیشروں کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیا۔ انھوں نے اپنا ڈکشن آپ بنایا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس میں ان کی کسی شعوری کوشش کا کوئی دخل نہیں۔ ان کا ذہن ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہے یعنی ان بندشوں سے بھی جو نام نہاد "جدیدیت" نے وضع کر رکھی ہیں اگر کسی قدر غیر جانبدار ہو کر دیکھیں تو "جدیدیت" نے بھی "ترقی پسندی" کی طرح کوئی کمی نہیں کی ہے۔ رجحان نے رفتہ رفتہ تحریک کی سی شکل اختیار کر لی۔ انور سلیم نے ان سارے جھمیلوں سے اپنے آپ کو دور رکھا ہے۔ اگرچہ ان کے ذہن اور فکر کی تعمیر ہندی زدہ راجستھانی (اودے پور) ماحول میں ہوئی ہے لیکن اردو محاورہ و زبان کی باریکیوں پر ان کی نظر گہری ہے۔ فن شعر سے بھی وہ کماحقہ واقف ہیں۔ لیکن فن کو انھوں نے اپنا راکب نہیں بنایا اپنا مرکب ہی رہنے دیا ہے۔

ملک و بیرون ملک کے اسفار نے بھی ان کے شعور کی کھڑکیاں کھولی ہیں۔ زندگی کے سرد و گرم نے ان کی سوچ اور فکر کے مہمیز لگائی ہیں ان کے اندر کے فن کار نے زندگی کو دور اور نزدیک سے ہر طرح دیکھا ہے۔ ان سب نے مل کر ان کی شاعری کا خمیر گوندھا ہے جو ایک طرح سے ان کے تجربات کا عکس بھی ہے اور اس سے فرار بھی۔ یہ ایک نہایت سیدھی سادی اور سچی شاعری ہے۔ اس میں فکر اور فن کے جھول یا جھالریں نہیں۔ جو کچھ انھوں نے محسوس کیا اپنے مخصوص ڈکشن میں بیان کر دیا ہے۔ ان کا یہ ڈکشن کسی سے مستعار نہیں یہ ان کی اپنی آواز

ہے۔ ان کے اپنے علائم ہیں، اشارے ہیں اور کنائے ہیں۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ اپنے علائم اور استعاروں کے اسیر بھی نہیں۔ علائم کی تکرار ان کے یہاں نہیں ملے گی۔ مطلب یہ کہ وہ اپنی آواز کے سحر میں بھی گرفتار نہیں ہوئے۔ ابھی تو ان کے شعری سفر کا آغاز ہے۔ خدا کرے کہ ان کے مزاج کا جو لیاد یا پن ہے اور جو ان کی شاعری میں بھی در آیا ہے وہ تا دیر قائم رہے۔

مظفر مجاز
(نومبر ۱۹۹۹ء)

نئے موسم کی آمد

مظہر الزماں خاں

الفاظ خالق پر صورت کی حیثیت سے نہیں بلکہ تحریر، تخیل، خیال اور علم کی حیثیت سے نازل ہوتے ہیں کہ نزول تخلیق کشف و کرامات ہوتا ہے کیونکہ جب علم تخیل میں شامل ہوجاتا ہے تو تحریر تخلیق کا باطنی لباس پہن لیتی ہے اور فکر، علم عالم میں جلوہ افروز ہوجاتی ہے تو زمین شعر ابد آباد ہوجاتی ہے کہ کشف عین خالق کو پہچان لیتی ہے تو تخلیق کے سارے اسرار و رموز عین العین ہوجاتے ہیں چنانچہ اچھی اور سچی شاعری کا پورا جسم موسیقی سے لبریز ہوتا ہے اور اس کی قرأت میں بہت سے سر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک عمدہ شعر ان گنت گھنگھروں کی چھم جیسا ہوتا ہے جو خاموش فضا میں گھل مل کر پوری کائنات کو نغمہ ریز کر دیتا ہے انور سلیم کی نظموں اور غزلوں میں بہت سے سُروں سے تعمیر کیے ہوئے مختلف نایاب محل موجود ہیں اور ان محلوں کی تعمیر ایک ماہر معمار کے تخیل اور فکر کا نتیجہ ہے مثلاً ان کی صفر پر لکھی ہوئی نظمیں۔ صفر سے لفظ تک اور لفظ سے صفر تک اور صفر سے لاانتہا تک پہنچنے کی کوشش میں معنویت اور معنویت کی حدوں کے اُن سروں کو چھونے کی کوشش کرتی ہیں جو کسی خاموش ساز کے جسم میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اور ان خاموش سازوں کو چھیڑ دے اور ان کے اندر چھپے ہوئے سُروں کو شعروں کا جسم عطا کرنا ہی شاعر کا سب سے بڑا کارنامہ ہوتا ہے۔

چنا چہ انور سلیم اپنی لؤلؤ و مرجان شاعری میں ان موسیقی کے نئے پیکر تراشتے ہیں جن سے نئے موسم اور نئے قارئینِ ادب دور دور تھے۔ انور سلیم کا یہ نیا شعری مجموعہ "پرِ ہوا کے" نئے موسم کی آمد کی بشارت دیتا ہے۔

منظہر الزماں خاں
۱۲/ اکتوبر ۲۰۰۰ء

انور سلیم کی شاعری

احمد ہمیش

حیرت ہے کہ انور سلیم نے حیدر آباد دکن جیسے درباری سرشت والے شہر میں بحیثیت شاعر صفر کا تصور کیا۔ جب کہ صفر فلسفہ اور ریاضی دونوں سطح پر ہندوستانی فکر کی ایجاد ہونے کے باوصف ازل و ابد، ہستی اور نیستی بلکہ انتہائی مثبت اور انتہائی نفی کا تصور ہے۔ صفر تلاشِ ناتمام ہے۔ سوامی وویکانند نے امریکہ میں مذاہب کی کانفرنس کے موقع پر یعنی شونیہ (शून्य) کے موضوع پر اپنے طویل خطاب کے دوران مادہ پرست اہلِ مغرب کو "کیا پایا اور کیا کھویا" کے تجسس و تحیر میں ڈال دیا۔ یہاں خیال رہے کہ شنکر اچاریہ کا فلسفہ مایا بھی تصورِ صفر کی ایک کڑی ہے مگر اہلِ مغرب کے یہاں عدمیت کی فکر اور پھر لایعنیت Absurdity کا رجحان بیک وقت ہندوستانی تصورِ صفر اور شنکر اچاریہ کا فلسفہ مایا سے مستعار لیا گیا۔

اس امر کو دھیان میں رکھتے ہوئے اگر انور سلیم کے شعری منصب اور تصورِ صفر کو ذرا دیر یکجا کر کے دیکھا جائے تو یہ ایک کانٹری بیوشن تو بے شک ہے۔ تاہم یہ مسئلہ شاعری کے قاری کا ہے کہ وہ انور سلیم کی غزلوں سمیت صفری سلسلوں کی نظموں کو کس زمرے میں رکھتا ہے! البتہ اس حد تک پڑھا لکھا اور باشعور ہے کہ مختلف زبان میں شاعری بہت سی اقسام میں ہوئی ہے وہ انور سلیم کی شاعری کو از قسم شاعری مانتے ہوئے داد ضرور دے سکتا ہے۔

استکشاف

انور سلیم

شاعری کی تعریف ادب کے بڑے بڑے سورماؤں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے کی۔ اگر کوئی صرف ایک ہی تعریف پڑھے تو اسے لگے گا کہ بات ٹھیک ہے۔ مگر بیک وقت کئی تعریفیں پڑھ ڈالے تو اسے محسوس ہوگا کہ شاعری کی مکمل تعریف تو کوئی بھی نہ کرسکا۔ یہ ہے چیز ایسی ہی۔ شاعر خود اپنے اس لطیف جذبہ کو نہیں پہچان پاتا۔ یہ جب سر اٹھاتا ہے وہ اس کی بات مان لیتا ہے۔ اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل لیکن کبھی کبھی۔ ورنہ یہ پاسبان اس کے سر کو کچل دیگا۔ اور اس کا جوش سرد پڑ جائے گا۔

دنیا کی ہر بڑی زبان کا ادب کئی ادوار میں منقسم ہے۔ ایک ہی سمت میں بہتی ہوئی دھارا کا رخ کوئی ایک جیالا یا کبھی کبھی مع چند معاون کے موڑ دیتا ہے۔ پھر ایک فاصلہ طے کرنے کے بعد کوئی اور اس کا رخ موڑ دیتا ہے۔ یہ عمل جاری و ساری ہے۔ معدودے چند نے اپنے زمانے کے رائج سکّہ سے اجتناب بھی برتا ہے۔

ایک انگریزی نظم "Unwritten Registry" میں شاعر Elaine V. Emans نے بڑی اچھی اور پیاری بات کہی ہے۔ اس کے مطابق ہر شخص کے حافظے میں اپنی اپنی پسند کے یادگار لمحے محفوظ ہوتے ہیں اور یہ کہ ہر شخص کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے۔ گو کہ لاکھ ایک دوسرے سے مختلف سہی مگر عجیب انداز سے اس میں مماثلت و مشابہت بھی ہے۔ وہ یوں کہ یہ ہر کسی کے دل کو گرماتے ہیں، ہر کسی کے دل کو اس سے تسکین و راحت ملتی ہے اور

ہر کوئی اس سے محظوظ ہوتا ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ کیوں نہ یہ بات شاعری پر بھی صادق آئے۔ یہ سوچ ہے ہی بڑی عجیب شئے! اس کا اظہار میں نے اپنی ایک نظم "جس کو دیکھو یہی سوچتا ہے" میں کیا ہے پھر ایک اور مختصر نظم "وجود" میں اپنی اوقات بھی بتائی ہے۔

میں شاعر ہوں، کس لیے شاعری کرتا ہوں؟ اس سے حاصل کیا؟ وغیرہ کئی قسم کے سوالات ہیں جن کا جواب خود مجھے بھی نہیں معلوم۔ گویا کہ میرا یہ سفر لا حاصلی کا ہے۔

بیکار تو ہوا کے یہاں باندھتا ہے پر

دفنا دے اپنی سوچ کو اندھے مزار میں = صفر

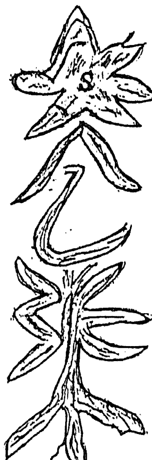
کہ لفظ صفر۔ بے معنی، با معنی، لا یعنی اور کیا!

اس کے چکر میں بھی پڑ کر دیکھ لیا۔ جس کے چند نمونے آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ اور بھی اس کتاب میں بھانت بھانت کی بات ملے گی۔ مگر ڈکشن کا فیصلہ آپ کریں گے کہ کس حد تک اس میں مجھے کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ درک، فہم، رسائی، ترسیل جیسے قبیل کے الفاظ کے مطلب سے میں بے خبر نہیں۔ کوشش میری یہی رہی ہے۔

"انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو"

(انور تسلیم)

لکیریں روشنی کی



Rehana



اعوذ "پناہ"

پاک سایہ ڈال دے
ناپاک مجھ کو چھو نہ لے
خوف اس کا چار سو
سامنا ہر ہر قدم

بسم اللہ "ابتدا"

نام پیارا، نام پیارا
ابتدا، بس ابتدا
نام سے تیرے
ہے تو
حد سے بے حد چاہنے والا
دَیا کا اک سمندر بیکراں

کلمۂ طیبہ "اقرار"

دوسرا کوئی نہیں، کوئی نہیں تیرے سوا
روح کی گہرائیوں سے آ رہی ہے یہ صدا
اس قدر تعریف کی تو نے کسی کی بھی کہاں
آخری پیغامبر بے شک جچتا ہے ترا

☪

سورۂ فاتحہ

بیاں میں لاکھ چاہوں بھی تو کر سکتا نہیں
کہ کائنات کے جنگل اور پانی
قلم و روشنائی میں بدل کر
ثنا خواں کے لیے ناکافی ہوں گے
یہ زمیں سب کچھ نہیں
ان گنت دنیاؤں کا تو پالن ہار
تیری لیلا اپرمپار
تو شفیق اتنا کہ مجھ کو آج تک
جو بھی مانگا وہ دیا
اور بیشک تو سمندر رحم دیا کا
مجھ سے سرزد ہو گئی ہوں گی
کئی گستاخیاں
پر سزا تو نے نہ دی
وہ گھڑی، وہ روز تیرے ہاتھ
تیرے بس کی بات
فیصلہ مخلوق کا

تیرے آگے سر جھکاتا ہوں
کہ تو
غیر کے آگے اسے جھکنے نہ دے
کون میرا ہے سوا تیرے
کہ تجھ سے مانگتا ہوں
سیدھا سیدھا راستہ
بھیڑ میں گم ہو نہ جاؤں
کر لے شامل مجھ کو تو اس قافلہ میں
برکتوں والا جو ہے
اور وہ
جن پہ ظاہر رہی تیری
ملامت
مجھ کو ان کے درمیاں
گرنے نہ دے
گرنے نہ دے
ایسا ہی ہو !

سورۂ قدر پر مبنی "شب قدر"

رات پیاری
قدر والی
ہے ہماری
جگ کے پالن ہار نے جس میں اتاری
روشنی
روشنی یعنی کتاب
ایسی کہ جو ہے بے مثال
پوچھتا ہے
کچھ تمہیں پہچان ہے
تم بھلا جانو گے کیا
عمر ساری
جو تمہاری
اس پہ بھاری
رات پیاری قدر والی
آسمانوں کے جو باسی
ساتھ ہیں سردار کے
دھرتی پہ آتے ہیں

کہ ان کو بھیجنا ہے
اور اس کا حکم ہے
میرے پجاری
رات ساری
جو جھکائے دل میری دہلیز پر
تم خبر لانا
اے لوگو!
مانگنا ہے جو بھی مانگو
وہ ندا کرتا ہے
ہیں تے
سارے دروازے خزانے کے
تمہارے واسطے
وا کیے ہیں
دور افق پر
جب نقیب
سورج کے آنے کی خبر دے
تب تلک
میرے، تمہارے
اور سب کے واسطے
سالم . . .
سلامت . . .
رات پیاری
قدر والی

"ستّر مساوی ایک"

نافرمان بچہ کا بھی بوجھ اٹھائے
ماں!
تھکتی نہیں ہے
تُو تو
۷۰ = ۱ (ستر مساوی ایک)
نافرمان سہی
میں بدکار سہی
ایقان مگر یہ ہے
۷۰ = ۱ ، ۷۰ = ۱ ۔

سواد اس قدر

کہ رستہ ہے
نہیں ہے
پتہ چلتا نہیں ہے
کرم تیرا چراغِ راہ
مسافت رخت مانگے
اور سفر ناآشنا میں ہوں
مجھے پردے
نہ دے
ہے تیرے اختیارِ شش جہت میں
مجھے منزل پہ پہنچا دے۔

نعتیہ نظم

نور ہی نور ہے! نور ہی نور ہے!
اور اس نور کا ایک ہالہ بھی ہے
جو کہ مرکز بھی ہے
روشنی کے سبھی دائروں کا
جس سے افلاک اور یہ زمیں سب کے سب
روشنی، روشنی کے سمندر میں غرق
جب سیاہی افق تا افق پھیلتی ہے
تو کوئی کرن پھوٹتی ہے
پھر یوں ہوا
کالی کالی لکیروں کی فوجوں نے گھیرا زمیں کو
تو آیا وہ ہالہ مٹانے انھیں
دیکھتے دیکھتے پھیلنے وہ لگا۔
اور تا حشر وہ پھیلتا ہی رہے گا

نعتیہ دوہے

دھوپ کی چنتا کون کرے کیا سورج اسے جلائے
چھاؤں گھنیری پیڑ کی تیرے جس کو بھی مل جائے

چاروں اور اندھیرا گھپ جگنو بھی نظر نہ آئے
ایسے رات کے راہی کو تو پل میں بھور دکھائے

کل کیا ہوگا میرا پاپی من جب جب گھبرائے
تب تب آس کا پنچھی اڑ کر تیری نگریا جائے

رب کے پیارے دَیا کا ساگر دینے پر جب آئے
اتنا دیوے تو پیارے لیتے لیتے تھک جائے

گنبد ہے اک ہرا ہرا جو سب کے من کو بھائے
اس کی چھاؤں ملے اگر تو سارا جگ مل جائے

کالی کالی کملی اپنے سر پر جب لہرائے
ڈر کاہے کا رب کا پھر جب چاہے بلاوا آئے

کبیرداس پیدائش: ۱۳۹۸ء۔ وفات: ۱۵۲۸ء

ہندی دوہا

عدد نکالو ہر چیز سے چوگن کر لو وائے
دو ملا کے پچگن کر لو بیس کا بھاگ لگائے
باقی بچے کے نوگن کر لو اس میں دو اور ملائے
کہت کبیر سنو بھئی سادھو نام محمدؐ آئے
۹۲

کبیرداس کے دوہے کا اردو ترجمہ۔ انور سلیم

تم نکالو عدد چاہے جس کا بھی ہو چار سے ضرب دو
دو جمع پانچ سے ضرب پھر بیس سے اس کی تقسیم ہو
جو بھی باقی بچے نو سے دو ضرب پھر دو جمع ہو وہاں
آئے نام محمدﷺ کبیرا کہے آنکھ سے چوم لو
۹۲

انور سلیم پ: ۱۹۴۸ء م ۱۳۶۸ ہجری
ہندی دوہے

۱۔ عدد نکالو ہر چیز سے اٹھ گن کر لو وائے
چھ ملا کے دس گن کر لو اسی کا بھاگ لگائے

باقی بچے کے تیرگن کرلو اس میں چھ اور ملائے
کہت سلیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم آئے
۷۸۶

۲۔ عدد نکالو ہر چیز سے تین گن کرلو وائے
دو ملا کے چھ گن کرلو بھاگ اٹھراہ کا لگائے
باقی بچے کے پچگن کرلو اس میں چھ اور ملائے
کہت سلیم سنو بھئی سادھو نام اللہ آئے
۶۶

۳۔ عدد نکالو ہر چیز سے تین گن کرلو وائے
دو ملا کے گیار گن کرلو بھاگ تینتیس لگائے
باقی بچے کے دس گن کرلو اس میں گیار اور ملائے
کہت سلیم سنو بھئی سادھو نام ابو بکرؓ آئے
۲۳۱

۴۔ عدد نکالو ہر چیز سے چوگن کرلو وائے
تین ملا کے دس گن کرلو بھاگ چالیس لگائے
باقی بچے کے دس گن کرلو اس میں دس اور ملائے
کہت سلیم سنو بھائی سادھو نام عمرؓ ہی آئے
۳۱۰

۵۔ عدد نکالو ہر چیز سے چوگن کرلو وائے
تین ملا کے دس گن کرلو بھاگ چالیس لگائے
باقی بچے بائیس گن کرلو اس میں ایک اور ملائے
کہت سلیم سنو بھئی سادھو نام عثمانؓ آئے
۶۶۱

۶۔ عدد نکالو ہر چیز سے دوگن کر لو وائے
ایک ملا کے دس گن کر لو بیس کا بھاگ لگائے
باقی بچے کے دس گن کر لو اس میں دس اور ملائے
کہت سلیم سنو بھئی سادھو نام علیؑ ہی آئے
۱۱۰

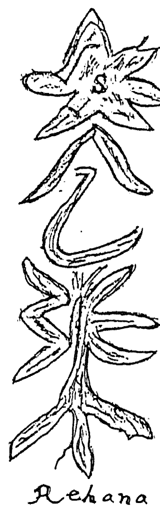
۷۔ عدد نکالو ہر چیز سے دوگن کر لو وائے
ایک ملا کے دس گن کر لو بیس کا بھاگ لگائے
باقی بچے کے تیر گن کر لو اس میں پانچ اور ملائے
کہت سلیم سنو بھئی سادھو، نام فاطمہؓ آئے
۱۳۵

۸۔ عدد نکالو ہر چیز سے دوگن کر لو وائے
ایک ملا کے دس گن کر لو بیس کا بھاگ لگائے
باقی بچے کے دس گن کر لو اس میں اٹھارہ ملائے
کہت سلیم سنو بھئی سادھو نام حسنؓ ہی آئے
۱۱۸

۹۔ عدد نکالو ہر چیز سے دوگن کر لو وائے
ایک ملا کے دس گن کر لو بیس کا بھاگ لگائے
باقی بچے کے بار گن کر لو اس میں آٹھ اور ملائے
کہت سلیم سنو بھائی سادھو نام حسینؓ ہی آئے
۱۲۸

لکیریں

مجھ سے وابستہ





والدہ کے انتقال پر

کیسی بجلی گری
کیا گھٹا چھا گئی
دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا !
ایک سایا تھا سر پر مرے پیار کا
میری قسمت نے وہ بھی نہ رہنے دیا !
زیست کے ایک اک موڑ پر
مامتا کا دیا
جگمگاتا تھا
وہ بجھ گیا !
گھپ اندھیروں میں اب
میں بھٹکنے کو بس رہ گیا !
سوچ کے سارے در اور دریچے
ہوئے بند جیسے
میں تھرّا گیا !
رفتہ رفتہ

ہوئی دل پہ دستک
جو دیکھا تو اک افق
اس کا روشن
منور تھا !
اور یہ
عمر بھر یوں ہی تازہ بہ تازہ
رہے۔ اے خدا !

ط

غزل

ہے بڑی پر پیچ میرے یار یہ راہ حیات
دے سہارا آ کے مجھ کو تھام بھی لے میرا ہاتھ
تو اگر میرے سفر میں ہم سفر بن کر چلے
راستے کے خار بھی گل بن کے دیں گے میرا ساتھ
میں تجھے گہرائیوں میں روح کی دیدوں پناہ
تو بھی کر لے جذب اپنی ذات میں یہ میری ذات
توڑ دے دیوار حائل ہے جو اپنے درمیاں
دل کے رشتے مذہب و ملت سے آگے کی ہے بات
یا میری منزل کی جانب بڑھ یا مجھ کو چھوڑ دے
حوصلوں پر منحصر ہے یار تیرا میرا ساتھ
منتظر کب سے کھڑا ہوں آ بھی جا اب تو سلیم
کیا مجھے تنہائی سے اپنی ملے گی بھی نجات !

۹

اب کسی اور ساگر کی مجھ کو نہیں جستجو

دشت در دشت میں پھر رہا تھا یوں ہی
تشنگی تشنگی چار سو
کچھ نہیں
اور پھر یوں ہوا
ایک سایا کہیں دور آیا نظر
بڑھ رہا تھا اُدھر
اور بڑھتا گیا
اپنے انجام سے بے خبر
ایک لمبی مسافت
جو طے کی ہو ہر ہر قدم پر
سرابوں سے لڑ کر
وہ کیا سوچتا تھا !
مگر ایسا کچھ نہ ہوا
چلتے چلتے جو آیا
تو پایا سمندر

اور اب اس کے ساحل پہ
بس آ کے رک سا گیا ہوں
یہ چاہے مجھے غرق کر دے
یا پھر تشنگی کو بجھا دے
مگر
اب کسی اور ساگر کی مجھ کو نہیں جستجو۔

نظم ۱۸؍جون

آج یادوں کے ہیں کچھ ورق پڑھ رہا ہوں
یہ اک اہم باب ہے
دو افق
دو ستارے
آہستہ آہستہ گردش میں آئے
پھر اک کشش
درمیاں ان کے ابھری
اور
بڑھنے لگے دونوں ہی ایک سمت
فاصلہ جس قدر کم سے کم ہو رہا تھا
مشکلیں اس قدر بڑھ رہی تھیں
مرحلے کر کے طے کیسے کیسے
آج کے دن میں رکھا قدم
ہر برس آج کا دن
مری عمر میں اہم ہے

جب کہ سورج تھا مہان
بس کچھ گھڑی کا
ساتھ ہلکی سی رم جھم کی شہنائیاں
اور ایسے میں
یہ دو ستارے
ایک مرکز پہ آکر رکے ۔

بیٹے ارشد کی سالگرہ پر

گھر میں چاند اترا پیارا میرا پیارا مخملی
جس سے ہو گیا ہے گھر کا گھر ہی سارا مخملی

طوطا مینا کو بھی آئے رشک ایسا ہے گلا
گھر میں گونجے میرے کیسا یہ پکارا مخملی

کوہ قاف میں جس کی آمد کے ہیں سارے منتظر
میری گود میں دیکھو ہے وہ ماہ پارا مخملی

آدھے دن کا سورج ہے یہ آدھے ماس کا چندا ہے
جتنے منہ اتنی باتیں ہیں لو چٹخارا مخملی

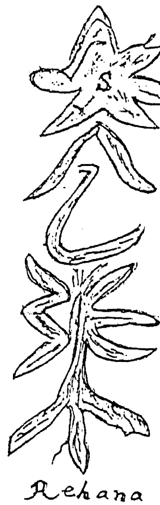
ڈیڈی امّی کا تو دل ہے لیکن سب کا لاڈلا
سب کا جایا ہے یہ سب کا ہے دلارا مخملی

کھیون ہار ہماری کشتی کے ہے تجھ سے یہ دعا
رکھنا سامنے اس کشتی کے یہ کنارا مخملی

ربّا مانگے تجھ سے تو اتنا ہی مانگے ہے سلیم
آگے چل کر ہو ہمارا یہ سہارا مخملی

لکیریں

چھوٹی بڑی





*

صرف ہوا

دستک ہوئی
دروازہ کھلا
ہوا ٹکرائی
کسی احساس نے کروٹ نہیں لی

آوازوں کے کام

ذہن
آئینہ ہے جس میں
کئی عکس
اپنے اپنے روپ دکھانے آتے ہیں
آوازیں
پتھر ہیں
آئینہ کو توڑ دیا کرتی ہیں۔

*

خودکشی

ایک سایہ چلتے چلتے رک گیا
آئینے میں دیر تک تکتا رہا
پھر اچانک
آئینے کو ایک جنبش سی ہوئی
اور وہاں کوئی نہ تھا۔

سفر

انگ انگ
تھک کے چور ہو گئے ہیں
چل رہا ہوں
کون
آواز ہے ؟
کیسی
آواز ہے ؟
اور کتنی
منزلوں کا ہے سفر ؟

کالا آنچل

سنّاٹا سنّاٹا
رات کو بھونکے
ایسا لگے
کہ کالے پلّے آنے والے ہیں۔
سہمے سہمے
بند گھروں کے
لوگوں کے اعصاب بتائے
رات اور دن کا فرق۔
کتنے منظر
شعلے ہی شعلے۔۔۔!
شہر کا حاصل
گہرا کالا دھواں!
کوّوں کی کائیں کائیں،
چیلوں کی جھپٹیں
پھر دلوں میں کالی لکیریں

اوران سب کے بیچ
زبانیں لٹکائے
کالے کتّے
آئے اور جائے
بچپن سے سنتے آئے تھے
لفظ قیامت
عکس قیامت دیکھا تو
تھرّا اٹھے۔۔۔۔۔

*

شکست و موت کے مابین

سمندر سست ہے
بیزار لگتا ہے
اسے یہ کیا ہوا ہے
کہ اس کی بے حسی جاتی نہیں ہے.
کبھی کنکر بھی سینے پر پڑا تو
یہ تڑپ اٹھتا تھا
مگر اب تو
بلائیں لاکھ اوپر سے گزر جائیں
کوئی ہلچل نہیں
غضب، غصہ، قہر
سب کیا ہوا.
عمل، رد عمل . . . .
شکست و موت کے مابین !

*

کالے لوگوں کا شہر

کنارے سمندر کے ہے روشنی شہر کی
کالے لوگوں کا یہ شہر ہے۔
جو ابھی خواب سے بس اٹھے ہیں
ابھی تک بچارے بہت درد و دکھ سہہ چکے ہیں
انھیں اب یہ محسوس ہونے لگا ہے۔
کہ ہم بھی تو انسان ہیں !
اور اب ان کے بیدار لوگوں میں
نفرت کے شعلے بھڑکنے لگے ہیں
یہ کہنے لگے ہیں
کہ رنگوں کی تفریق کا یہ سبق
تم کو کس نے سکھایا
یہ تم بھول جاؤ کہ ہم کون کیا تھے
تمہیں یہ بتائیں گے ہم کون کیا ہیں۔ !

(تنزانیا کے دارالحکومت دارالسلام میں کہی گئی)

*

گنبدِ بے در کی چیخ

سنبھالو
روشنی بڑھ کر
نکالو
رات کے ملبے سے
بچالو
کھنڈر اندر کھنڈر دھنسنے سے اس کو
اچھالو
ساعتیں
لیکن نہ کچلو
نہ جانے اس عمل میں
کون سی ساعت چلی آئے سفر کی !

*

گھٹن

چند تصویر بتاں کا
رقص دیواروں پہ ہے
چشم ماحول نیم وا
میکدوں سے دور
میرا یہ تصور میکدہ
خوف سے مچھلی پڑی ہے نیم جاں
آئینہ ٹوٹا تو اس کی کرچیاں
اور کس سے کھیلتی خوں کے سوا
ہنس زخمی دیکھے کتّے کی زباں
میں ابھی تو دیکھتا ہوں
منہ تیرا ہلتا ہوا
جب جمی آواز پگھلے گی تو پھر
سن لوں گا میں
پل کے ادھر بھیڑ اتنی ہے کہ ہم
دھیان رکھیں کیسے سائڈ ہوس کا

میں کہاں ہوں ؟
کون سی دنیا میں ہوں ؟
یہ کیا جگہ ہے ؟
یہ سوال
ہرکیولس نے بھی کیے تھے
اور پیریکلس نے بھی
لیکن
ان دونوں میں کتنا فرق ہے ؟
تجربہ مر مر کے زندہ ہونے کا
تجربہ
بس تجربہ ہی تجربہ !!

*

ایک چہرہ حسیں

ایسا لگتا ہے کہ نہایا ہوا
روشنی میں تمہارا چہرہ ہے
آؤ آؤ قریب تو آؤ
اپنی آنکھوں کی اس سیاہی کو
دور کر دوں میں دو گھڑی بھر کو
پھر نہ جانے یہ موسمی بادل
کب گزر جائے تپتے صحرا سے
دور سیراب وادیوں کی طرف
ایسا لگتا ہے کہ نہایا ہوا
روشنی میں تمہارا چہرہ ہے
آؤ آؤ قریب تو آؤ ۔
اپنی بے باک آرزو سے اگر
دور جانا بھی چاہوں
جا نہ سکوں
روشنی روشنی کے ساتھ رہے

تو اندھیروں کا کون رکھوالا ؟
مان کر یہ سیاہی کو مرکز
دائرہ آنکھ کا بنایا گیا
آؤ آؤ مجھے یہ موقع دو
روشنی کو بنا کے مرکز میں
دائرہ آنکھ کا بنا ڈالوں
آؤ آؤ مجھے یہ موقع دو
ایسا لگتا ہے کہ نہایا ہوا
روشنی میں تمہارا چہرہ ہے
آؤ آؤ قریب آجاؤ !

*

ڈوبتی آواز

اچھالتا ہوں ہوا میں لمحے
یہ سوچ کر ہی
کہ اس زمیں نے
دیا ہے کیا
مجھ کو کیا یہ دے گی ؟
عجیب احساس کا ہے سایا
جو سر پہ منڈلا رہا ہے میرے
میں جی رہا ہوں جو تو گو وہ
زندگی نہیں کوئی اور شئے ہے
اداس لمحوں کی ہر کڑی کو
کہاں تلک جوڑتا رہوں گا ؟
یہ سلسلہ لگ رہا ہے ایسا
کہ زندگی میں نہ ختم ہو گا
کہ ہڈیوں سے چپک رہا ہے
یہ گوشت میرے بدن کا دیکھو

ان ہڈیوں میں چھپا مسالہ بھی
ہڈیوں کو گلا رہا ہے
اور پھر ایک دن
کھال میری سمٹ جائے گی
اور مشک یہ
سوکھ جائے گی، سڑ جائے گی
بس دائرے
ڈوبتی ہوئی آوازوں کے
پھیلتے جائیں گے۔

*

نور کی اک بوند کا یہ دو رپیا سا ہے

الف خلاؤں میں چھلانگیں ہیں
اور روشنی کی جستجو ۔

ب وہی مسئلے روشنی کے ہیں جو
آج سے سینکڑوں سال پہلے بھی تھے
مگر پہلے اک نور کی بوند کوئی
بدن میں چھپائے کبھی آتو جاتا
ابھی ہم فلک پر پہنچنے لگے ہیں
مگر نور کی بوند اپنے بدن میں
چھپائے کوئی مل رہا ہی نہیں ہے

ج ہوا کا زور شور ہے
سمندروں کی موج
پیٹھ ساحلوں کی ہے

د ابھی بھی فلک گو بجتا ہے تو ہم
یا خدا کہہ ہی دیتے ہیں ۔
ابھی بھی زمیں گھڑ گھڑاتی ہے ۔

ہم یا خدا کہہ ہی دیتے ہیں
ابھی بھی سمندر میں لہریں مچلتی ہیں
ہم یا خدا کہہ ہی دیتے ہیں
تو وہ لوگ صدیوں پرانے
جو آکاش دھرتی سمندر کے بارے میں
کچھ بھی نہیں جانتے تھے
ہم ان سے آگے کہاں ہیں ؟
روشنی کے لیے ترستا ہوں
کون جانے کہ یہ اجالا بھی
جس سے آنکھوں کی نبض چلتی ہے
کب یہ سایہ کے ساتھ ہو جائے !

*

خامشی دو دلوں کی

"ایک شاعر کے آنسوؤں کا محل
کتنا مضبوط! کہہ نہیں سکتا
کیا کبھی ڈھ نہیں سکتا
ہاتھ لگا کر دیکھو"

"میرے سینے میں رواں خاموش
دریا ہے۔
یہ سفر لمبا ہے کتنا
اور کب تک
فرض یہ انجام دینا ہے مجھے
کچھ بتاؤ"

"تم میرے احساس کا درپن نہ سمجھو
اس ورق کو
میں تو خود ہی آئینہ ہوں

سامنے آکر دیکھو"

"آئینہ اک میں بھی ہوں
لیکن
ایک ہی عکس کا پرستار
(اور بھی آتے ہیں)
اور اس سے بڑھ کر اک آواز ہوں
آواز!
جو بیمار ذہنوں کا علاج ہے"

"ہا.... ہاہا.... ہا.... ہاہاہا....!
آواز!
جو رکتی نہیں ہے
جانتی ہو
تھک جائے گی..... تھک جائے گی... تھک جائے گی
اور تیرا ذہن
خود بیمار ہو جائے گا"

"تو میں کیا کروں....
میں کیا کروں....
میں کیا کروں....
میرا کوئی ذہن نہیں
کوئی تصور نہیں"

"میں بھی یہی سوچتا ہوں
یہی بات ہے
اور اسی بات پر
لوگ تھوڑے دنوں بعد
پاگل کہیں گے مجھے
اور تو!
درمیاں اس کے
خود بہ خود ہو جائے گی
باوری"

(گلزار کی فلم خاموشی دیکھنے کے بعد کا تاثر)

*

میرے عہد کے لوگوں سے

ایک شاعر کا تصور
اس قدر سنگین
اور اتنا بھیانک
ہو بھی سکتا ہے
کبھی کیا تم نے سوچا ہی نہیں
میری نس نس
جو سکڑتی پھیلتی جاتی ہے
دل جو پسلیوں میں جا کر
پھنس گیا ہے۔
اور دھڑکن بھی کبھی
محسوس ہوتی ہے
کبھی ہوتی نہیں
اس کے ذمہ دار کون؟
وہ!
جو سمجھنے یہ لگے ہیں

کھیتیاں انسان کی ہونے لگی ہیں
اور کچھ حصوں میں
یہ فصلیں بھی کاٹی جا رہی ہیں
بولو
میرے ذہن کو
اسکیزوفرینیا کا گھر
تم کو بنا کر کیا ملے گا ؟
تم ہنسو گے کچھ دنوں کے بعد
میری حرکتوں کو دیکھ کر
بس یہی ! بس یہی !!
بس یہی . . . .
اور کچھ نہیں .

(ویت نام جنگ کے دوران لکھی گئی)

*

انتشار

خواہشوں کی دنیا میں
دور تک اندھیرا ہے
صبحِ نو کی امیدیں
راکھ راکھ بکھری ہیں
پھیلتی ہوئی دنیا
آکے میری آنکھوں کے
صرف ایک نقطہ میں
آج پھر سے سمٹی ہے
جانے کس طرح کا ہے
یہ خموشیوں کا بن
قہقہوں کے سائے بھی
دیکھو لاشے لاشے ہیں
پھول کی مٹھاسوں میں
زہر زہر گھلتا ہے
مکھیوں کے جھنڈوں میں
کیسا شور برپا ہے
اس طرح بکھیروں میں
کون لکھنے والا ہے
حرف حرف مرتا ہے
یہ عجب جھگڑا ہے!

*

خاموشیوں کا نگر

دیکھ لو آخری یہ سفر
جس کو کہتے ہیں
انجانی سمتوں کی اور
بھلا اس سے آگے بھی کوئی نشاں
منزلوں کے ملیں گے ؟
یہ سرحد ! یہ سرحد
کہ معلوم ہے کس کو
کن سرحدوں سے ملی ہے ؟
کہ خاموشیوں کا نگر !
یا کہ قیدوں کی ہے راحتیں !
یا کہ ناٹک کا ہے سین یہ دوسرا ؟
کہاں کون رستہ ملاتا ہے اس سے
نہ میں جانتا ہوں
نہ تم جانتے ہو
چلو تم تو اس بھیڑ کے ساتھ ہی

جو کہ پل پر سے ہو کر
گزرتی رہی ہے
وہ دیکھو
وہ خاموشیوں کا نگر
خوف کی کالی چادر میں
لپٹا پڑا ہے !

*

ایک خواہش سے پہلے

سوچ لو
کہ زندگانی کچھ نہیں
جانے کس کس موڑ سے میں ہو کے گزرا
کتنے راہوں کے اندھیرے
اور اجالے ساتھ تھے
پھر بھی میں تنہا سفر کرتا رہا
سوچ لو
کہ یہ جوانی کچھ نہیں
آرزوؤں کا جنازہ
ڈال کر کندھوں پہ میں
اور صدیوں کا پرانا
اک تصور ساتھ میں
پھر بھی تو میں ہوں
اکیلا ہی اکیلا
تو سنو

میری کہانی کچھ نہیں
صرف آوازوں کا اک گہرا سمندر
حلق میں الفاظ کی تیکھی چبھن
اک گھٹن
اور چاروں اور
اک گہرا سکوت
دنیا والو
مہربانی کچھ نہیں
بھول جانا مجھ کو
کہ . . . . .
میری نشانی کچھ نہیں
میری کہانی کچھ نہیں
میری جوانی کچھ نہیں
یہ زندگانی کچھ نہیں ۔

*
آخری جائزہ اس سفر کا

کہ میں دیکھتا تھا
اگر تیری آنکھوں میں قوس قزح ٹوٹ جائے
تو میری ہتھیلی کی ریکھاؤں میں جنگ ہو جائے
مجھے دل کی گہرائیوں سے کوئی ڈھونڈ کر پھر نہ لائے
مجھے روح کی بس فصیلوں، حصاروں میں قیدوں میں دھر کر
مجھے سب پناہوں سے آزاد کر دے
کہ جو سانس ہے آج کی نوحہ گر
وہ ہزاروں برس کے نہ قصّے سنائے
یہ لمبی مسافت جو طے کی ہے میں نے صفر سے یہاں تک
وہ سب بس پرت در پرت دب کے آگے بڑھی ہے
بہت کچھ گنوایا ہے، پایا ہے۔ پھر بھی
ابھی تک ہے میرا سفر نامکمل

- - - - - -

تو میں دیکھتا ہوں
تیری آنکھ ہفت رنگ دیوار خود ہے
میرے دل کی گہرائی میں ریت ہے
میری روح میں اک خلا ہے
سفر اس زمیں پر مکمل نہ ہوگا۔
ہتھیلی کی ریکھاؤں میں شور ہے

*

من کا پنچھی

من کا پنچھی چھٹپٹا کر
تن کی سلاخوں سے ٹکرا کر
جانے کس وقت
اوڑھ لے یہ کالی چادر
اس سے پہلے
کوئی میری پسلی سے نکل کر
پشتارہ میری تنہائیوں کا اٹھا کر
ساتھ ہیں چل دے میرے سفر پر

وجود

ایک بڑے سادہ کاغذ پر
آڑی ترچھی ریکھاؤں ہیں
چھپے ہوئے اک نقطہ کے
کون سے حصے کا حصہ
دائرہ اپنا !

*

قضیہ

قمر، خورشید و انجم
چاند، سورج اور تارے
ہے کیا تفریق ان میں
زبان میری سمندر
ہیں جس میں
ہمہ اقسام موتی اور گہر
مرے جو ہاتھ آجائے
اسے لے لوں
سجاؤں
اپنی تحریریں
یہ جھگڑا
اور
یہ قضیہ
کیا ہے
لی پی اور رسم الخط کا!

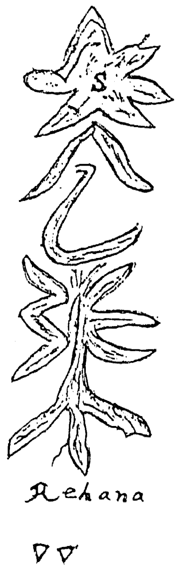
*

ایک نظم

جس کو دیکھو یہی سوچتا ہے
کہ جو اس کو کرنا ہے
یا جو کیا
یا جو وہ کر رہا ہے
وہی سچ ہے
اور میں
اسی کشمکش میں الجھتا ہوا
کیا غلط، کیا ہے سچ
بس کھڑا ہوں
سوچتا ہوں
کہ
اپنے ہی ہاتھوں سے
پَر سوچ کے کاٹ ڈالوں !

لکیریں

خالی



Rehana



صفرِ ہستی

ہے یہ جیسے نام میرا
لفظ
بے معنی و مبہم
جانتا ہے کون
کتنے لوگ....
اگر پہچاننے کا مرحلہ آئے
تو گونجے
نہیں تو....
صِفر
کہ یہ بھی لفظ ہے
واضح
نہیں ترسیل کا بھی مسئلہ
جو منفی اور مثبت
کائنات
وجود

سب پر محیط
کہ یہ ہے ابتدا بھی انتہا بھی
جزو کل بھی
اور شامل بھی الگ بھی
مگر پھر بھی تو ہے صِفر
کہ بس یہ صِفر ہے صفر
ہے میرا نام کیا ؟
اور میں۔ ؟ ؟

صفریں

جگہ جگہ نچا ہوا
تڑ مڑایا
درد پہلو میں

. . . .

کٹی پھٹی
ہڑبڑائی نیند
آنکھ میں

. . . . . .

رات
اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ
آسن جمائے
دونوں کے بیچ
اور نہیں کہیں کوئی
تو میں . . . .
صفریں !

صفر شعور

ایک سورج
ایک چاند
اور اک چراغ
دوستی تینوں کی اندر
دشمنی باہر
ہوا کا ہے چراغ
چاند کا ہے دن
تو سورج رات کا
پرت اندر پرت
ہیں کیفیت کے سب اسیر
مضمحل اور ناتواں
قوی امید کا ہے آسرا
میرا احساس اور تحت الشعور
لفظ لفظ رائیگاں
فقط حاوی
شعور صفر!

صفر رشتہ

ایک آہٹ
ایک دستک
ایک سایا
پھر کوئی جھونکا ہوا کا
دیکھنے والوں نے دیکھا
اور کیا کیا
میں نے تو محسوس کچھ ایسا کیا
رشتہ بے نام جیسا
اک کرشمہ ہے صفر کا۔

صفر معاملہ

زمین و آسماں ہیں
فکر کا سنہرا جال
خوف افق کی آنکھ
دھوپ چھاؤں
رات دن
بازی گری کس کی
ہنسی اداس
غم ہے خوش
کہ بحر فکر ہے اتھاہ
جانتا ہوں
چاہتا ہوں
چاٹ لوں
زبان ذائقہ کھے
معاملہ ہے صفر کا

صفر کا دائرہ

دھواں اٹھا
دھواں پھیلا
دھواں تحلیل جب ہونے لگا
تو کچھ لوگوں نے دیکھا
ہوا پھر ایک وقفہ۔
بیاں جب ماجرا ہونے لگا
تو ہر اک شخص کی اپنی زباں تھی
وہ جانے کیا تھا
کوئی حادثہ تھا؟
سانحہ تھا؟
کوئی قصہ نہ جانو
واقعہ تھا
جو مجھ سے پوچھتے ہو تو
بتاؤں؟
کہ صفر کا وہ دائرہ تھا!

صفر ضد

صفر کے دھندلکوں میں
کچھ نظر نہیں آتا
سوچتا ہوں
رات کو اجالوں
اور دن سیاہوں
کچھ تو اپنے اندر ضد پیدا کروں
چہرے نوچ ڈالوں
پرتیں تہہ و بالا کروں
ایک ایک خط جوڑ کر
واضح صورت بناؤں
جسے میں خود دیکھ سکوں
اور دکھاؤں !

صفر سایہ

سفر تھا رات کا
تاریک لمحہ
مرے قد کے برابر ایک سایہ

. . . . . .

کہ صدیوں بعد
سفر دن کا تھا
اور لمحے کئی روشن
وہی سایہ
کبھی چھوٹا
کبھی مجھ سے بڑا ہونے لگا

. . . . . .

کوئی گوشہ
کہیں گہرائیوں میں
روح کی لرزاں
سفر دن کا

سفرِ شب کا
مسلسل
نامکمل
تجزیہ تھا جان لیوا
کہ ان کے درمیاں
کھڑا تھا
صفر کا سایہ

صفر عکس

زمیں پر
جیسے ہی پڑنے لگا
یوں "صفر" کا عکس
وہیں
لہرا دے
کچھ پھریرے روشنی کے
فلک پر ۔
نکیلی! خار دار پتھریلی بنجر
اب زمیں چاہے رہے
یا نہ رہے
مسافت میں رکاوٹ بھی نہیں
یہاں تک ۔
مری حد نظر تک
صفر کے عکس
بکھر کر
ریزہ ریزہ ہو چکے ہیں !

صفر شب

رات کے پہاڑ پر چڑھنا
بدن کا
ایسا
جیسے بگ کی بات
کوئی انگلی پکڑے نہیں
پگڈنڈی خود تلاش میں ہے
اگر ہتھیلی مانع ہے
تب . . . .
سب کاوشیں صفر

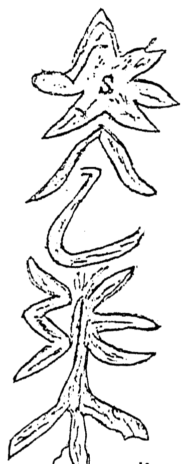
انتشارِ صفر

شب تاب شب تاریک جنگل
آس گامزن
رجز آس پاس
گہنائے دہر کی بیلا
روپہلی کاکل رنگ
وادیٔ خواب
بیم منہ کھولے
آشفتہ
ناپائیدار اندیشے
گمان و وہم
یقین و سچ
تکرار
پھر
انتشارِ صفر

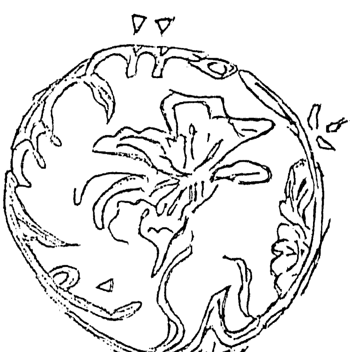
صفر صفر سلسلہ سلسلہ

صفر سے نکلا
صفر میں پہنچا
صفر سے باہر اگر میں آؤں
تو سلسلہ ایک سلسلہ ہوں
یہ سلسلہ جو ہے ایک دشمن
وفا، محبت کا، دوستی کا
مگر صفر دوست بھی نہیں ہے
وجود، ذات اور انا کا
یہاں سلاسل
وہاں سلاسل
میں توڑ پاؤں کہاں سلاسل
یہی ہے انجام
بس! یہی ہے
صفر صفر سلسلہ صفر ہے۔

لکیریں
رنگ برنگی



Rehana



غزل

تجھ سے ملنے کے ہیں آج پل ریشمی
کیا پتہ میرا ہوگا بھی کل ریشمی

خط بدن کے تیرے سب نمایاں کروں
کھینچوں تصویر ایسی سجل ریشمی

تیرے رخسار ہیں دو بدو میرے جب
کیوں نہ دل میں کھلیں پھر کنول ریشمی

ذہن و دل پر ہے قبضہ مکمل تیرا
خواب آتے بھی ہیں آج کل ریشمی

تیرا غصہ ترا روٹھنا بھی غضب
تیرے ماتھے کا ہر ایک بل ریشمی

تیرے آنچل میں ساری تھکن دور ہو
چھاؤں بھی ریشمی تیرے پھل ریشمی

خبر لہجے کی میرے نہیں آج تو
چار سو اس کے ہیں دل کے دل ریشمی

یہ سلیم ایک چہرہ کا احسان ہے
ورنہ لکھی نہ میں نے غزل ریشمی

غزل

یہ راکھ کا ہے ڈھیر تو اس کو ہوا نہ دے
جو بجھ چکا ہے اس کو شرر کا پتہ نہ دے
لب سی لیے ہیں اس سے تجھے گر سکوں ملے
خاموش لب کو اور کوئی اب سزا نہ دے
دل کے ورق ورق پہ ترے پیار کی اے دوست
تحریر جو لکھی ہے اسے یوں مٹا نہ دے
تیرے بغیر زندگی مجھ سے وفا کرے!
ایسی تو کم سے کم تو مجھے بددعا نہ دے
آرام پائے گا نہ مری چھاؤں میں مگر
بے برگ و گل سمجھ کے مجھے تو گرا نہ دے

غزل

ساتھ تیرے جو گزارے تھے وہ پل محفوظ ہیں
سطحِ دل پر کھِلنے والے سب کنول محفوظ ہیں

رُت کے تیور سے نہیں لرزاں یہ اوروں کی طرح
یہ شجر وہ ہے کہ جس کے سارے پھل محفوظ ہیں

جھونپڑی والوں کا کہنا واجبی لگتا تو ہے
تم نہ اتراؤ تمہارے کیا محل محفوظ ہیں

آج کو مٹھی میں کر لو بند مت سوچو کبھی
آنے والی زندگی کے کل کے کل محفوظ ہیں

یہ نہ پوچھو زندگی کیسے گزاری ہے سلیم
کون اب گنتی کرے کہ کتنے پل محفوظ ہیں

غزل

رین بسیرا چڑیوں کا ہو
ایک درخت اپنا ایسا ہو

پت جھڑ ساون جو بھی آئے
ہر موسم میں وہ تنہا ہو

پھول ہوں دھانی پھل رس والے
ہر کوئی اس کا رسیا ہو

مور بھی ناچے اس کے قریب اور
کوئل کوکے جب برکھا ہو

طوطا ، مینا ، کوئل ، بلبل
ہر پل نغمہ ہی نغمہ ہو

چھاؤں گھنی سورج پرواے
دن گرمی کا بھی ٹھنڈا ہو

غزل

کوئی طوفان سمندر نہ اٹھانے دے گا
اپنی سرحد میں ہواؤں کو نہ آنے دے گا

تیرے اطراف ہیں اونچی یہ فصیلیں کیسی
ایک اک کرکے انھیں کیا مجھے ڈھانے دے گا

میری دہلیز پہ یوں پھیل کے بیٹھا کیوں ہے
درد کیا تو مجھے باہر نہیں جانے دے گا

چھت یہ بوسیدہ ہے ٹوٹے گی کسی دن سر پر
کون پھر اس کو بھلا ہاتھ لگانے دے گا

یہ نہ سوچا تھا سرِ راہ ملیں گے اس سے
وہ کھنڈر شکل ہمیں نقش پرانے دے گا

اُس کو دیکھوں تو مرے دل میں یہ خواہش جاگے
کیا دھنک رنگ کوئی رنگ چرانے دے گا

دشت پھر دشت ہے کھیلے گا بگولوں سے سلیم
مجھ کو لیکن نہ کبھی خاک اڑانے دے گا

غزل

اُس کے استقبال کو حاضر مری چوکھٹ ہے یہ
جانتا ہوں دندناتی رات کی آہٹ ہے یہ
دھوپ سے لبریز تھا جو جام خالی ہوگیا
اب تمہارے سامنے بس ملگجی تلچھٹ ہے یہ
سایا سایا چیختا ہے آدمی کوئی نہیں
ہم خرابہ اس کو سمجھیں یا کوئی مرگھٹ ہے یہ
تم اسے کچھ بھی کہو تیشہ ہے میرے ہاتھ میں
دشت سے دریا اگلوا کر رہوں گا ہٹ ہے یہ
کیوں طنابیں کھینچ دیں کیا تم کو یہ احساس ہے
رت بدلنے کی جو ساعت ہے وہی کروٹ ہے یہ
کچھ تو آخر تو بتا تیرے بدن کو کیا ہوا
تان کر رکھی تھی چادر کیسی پھر سِلوٹ ہے یہ
جان بیوا ہے مگر سمجھاؤں دل کو کس طرح
دیکھنا قطرہ میں دریا ایک ہی بس رٹ ہے یہ
پیاس درک و فہم کی کس واسطے! آؤ یہاں
مٹکیاں لے جاؤ بھر کے علم کا پنگھٹ ہے یہ
جھوٹ کہتے ہو زمیں پہلے جو تھی سو اب بھی ہے
زلزلہ آیا نہیں تو کیسی پھر سِلوٹ ہے یہ
دل کا چہرا صاف آتا ہے نظر اس میں سلیم
آنکھ کا گھونگھٹ بھی کوئی دوستو گھونگھٹ ہے یہ

غزل

ہتھیلی بیچ ناپے ہتھیلی بیچ تولے
شجر اپنی زمیں کا کہاں پھر راز کھولے
صدا ایک لخت ابھرے صدا پھر کان کترے
زباں تردید کی اب یہاں کوئی نہ بولے
پربت دھرتی کی کٹ کر بدل دیتی ہے ہیئت
مگر یہ آدمی تو ذرا سا بھی نہ ڈولے
ہوا ٹھنڈک نہ اگلے نہ بادل برف پھینکے
چتا کے زخم سالم نہ سورج کے پھپھولے
نہ ہے بستر ہی زر کا نہ زیور کی دُلائی
تو سر گھٹنوں میں رکھ کر تسلی ہی کو سولے
لٹکتی تھیلیوں میں کئی سر منتظر ہیں
کہ شاید ہاتھ کوئی سکیم ان کو ٹٹولے

غزل

ہے جن میں یہاں جتنا بھی دم بول رہے ہیں
گونگے ہی نہیں بلکہ صنم بول رہے ہیں
یہ رات کی آہٹ نہ ہو یہ میرا گماں ہو
سناٹے ہیں یہ کس کے قدم بول رہے ہیں
پشتارہ اٹھائے ہوئے یادوں کے چلے ہم
بے رخت ہیں رکھنے کو بھرم بول رہے ہیں
کیا ہم کو جدا ہو کے زمانہ نہیں گزرا
پھر کیوں یہ گماں ہے تمہیں ہم بول رہے ہیں
الفاظ کے تم ایسے حصاروں میں گھرے ہو
کچھ سوچ ہے کچھ اور قلم بول رہے ہیں

غزل

یاد ہے آج تلک زہر کا ساغر رکھنا
میرے ہونٹوں پہ مری پیاس کا خنجر رکھنا

کرچیاں جان بھی لے سکتی ہیں غفلت ہو تو
کانچ کی آنکھ میں کوئی بھی نہ منظر رکھنا

دوستی کا یہ تقاضا بھی تو ہو سکتا ہے
اس کا دانستہ مری راہ میں پتھر رکھنا

جانے کس موڑ پہ احساس ہو خالی پن کا
اپنی جھولی میں گہر ایک چھپا کر رکھنا

اے خدا ہجر کا موسم نہ پلٹ کر آئے
میں جہاں جاؤں مرے ساتھ مرا گھر رکھنا

کون سے ملک کی لائے وہ خبر کیا معلوم
سوچ کی ڈال پہ کوئی تو کبوتر رکھنا

لاکھ اُگلے کوئی رت زہر ہلاہل لیکن
دھوپ چھاؤں کا سفر اپنے ہی اندر رکھنا

میرا انداز بیاں اور نہیں تو نہ سہی
میرے مالک تو مجھے پھر بھی سخنور رکھنا

غزل

بھروسہ کر کے پچھتائے نہ جانے کتنے ساون پر
نظر ڈالو ذرا تم ہی ہمارے خشک آنگن پر

سمجھ کر سوچ کر اطراف اپنے آگ دہکانا
شرارہ جان لیوا کوئی آجائے نہ دامن پر

لپٹتے ہیں جو خوشبو سے بھلے معلوم ہوتے ہیں
مگر کچھ اور ہی دیکھا نظر ڈالی جو چندن پر

ہمارے درمیاں سے حادثے گزرے کئی لیکن
نظر کی گرد میری آج تک ہے تیری چلمن پر

یہ گھر کھنڈہر[1] سہی لیکن بظاہر گھر ہی لگنے دو
بہت کچھ منحصر ہے سامنے کے رنگ و روغن پر

نمائش پر تری مر جاؤں ہیں لیکن پس پردہ
دمکتی رات بیٹھی ہے تیرے پازیب و کنگن پر

[1] کھنڈر ( ) ہندی لفظ ہے اور اس کا تلفظ "کھنڈہر" ہے لیکن اردو میں "کھنڈر" مستعمل ہے۔

غزل

رنگ و شکل و روپ کے ہیں مختلف چہرے یہاں
ہاتھ کی ریکھائیں دیتی ہیں مگر پہرے یہاں
ٹوٹتے ہی جا رہے ہیں کانچ کے برتن مگر
کرچیوں کے زخم ہوتے ہی نہیں گہرے یہاں
وادیوں آبادیوں سے آ رہی ہے اک صدا
میں ہوں زندہ اور کوئی بھی نہیں ٹھہرے یہاں
چیخ اندر کی ہو یا باہر کی حاصل کچھ نہیں
سب کے سب لگتا ہے مادر زاد ہیں بہرے یہاں
سات رنگوں کی کمانیں رقص میں تھیں اس طرف
زرد پھولوں کے لٹکتے تھے مگر سہرے یہاں

غزل

تجھ کو اس بات کا شاید نہیں کچھ اندازہ
تجھ سے وابستہ ہر اک زخم ہے اب تک تازہ

پنجۂ وقت نے اس طرح دبوچا ہم کو
قرض تیرا ہے یا میرا ہے مگر خمیازہ

بعد مدت کے ملاقات ہوئی جب تجھ سے
کچے دھاگے کی پکڑ کا بھی ہوا اندازہ

ایک لمحہ بھی بدل جاتا ہے صدیوں میں کبھی
رچ گیا بس گیا وہ پھول ہو جیسے تازہ

رہ چکی تھی کبھی تو بھی مرے شعروں کی کتاب
یہ الگ بات ہے وہ رہ گئی بے شیرازہ

کام معمولی سی دستک نے سلیم ایسا کیا
کھول کے رکھ دیا ماضی کا حسیں دروازہ

غزل

بارش ہوں میں بھی وقت اگر اک چٹان ہے
اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اللہ مہان ہے
طوفاں کا زور بیچ سمندر، بھنور قریب
ایسے میں وقت تھامے ہوئے بادبان ہے
دریا بدل کے رخ کہیں آتا ہے اس طرف
صحرا کی پیاس کا بھی عجب یہ گمان ہے
میں پھیل کر غبار کی صورت تو اٹھ گیا
اب ڈھونڈتا ہوں صدف کہاں آسمان ہے
بس اور فاصلے تو سبھی ختم ہو گئے
کالی ہوا کی آنکھ نقطہ درمیان ہے
کیا سخت ہو گیا تھا مرے ہاتھ میں سلیم
وہ پھول ثبت جس کا ابھی تک نشان ہے

غزل

سوچ کے اولے گرتے ہیں اور سر کی نس نس پھٹتی ہے
کیسا موسم آیا ہے ہر سانس کی طاقت گھٹتی ہے
ہاں، تونے تو خوب نبھایا رشتہ لیکن کیا کیجے
دونوں چھور ملانے والی ڈوری خود ہی کٹتی ہے
پاپ ہے ایسے شہر میں رہنا جس نے دل کو مار دیا
میرے اندر بیٹھی مینا کیوں یہ فقرہ رٹتی ہے
تو کیوں گھبراتا ہے تیری حالت پر جو ہنستے ہیں
وہ کیا جانیں جیون پتنگ دو حصوں میں بٹتی ہے
دور کی روشن دنیا سے تو اچھا دل کا اندھیارا
وہ تو جب بھی ہاتھ بڑھاتا ہوں میں پیچھے ہٹتی ہے

غزل

کیا بنا کے رکھ دیا ہے دیدنی منظر مرا
تجھ سے ملنا تھا کہ بس چرچا ہوا گھر گھر مرا
آئینوں میں عکس کوئی اور ہی مجھ کو لگے
کون پیچھا کر رہا ہے اس طرح چھپ کر مرا
گھر کا نقشہ بن نہ پایا تھا کہ ہلچل ہوگئی
کون جانے کب کہاں کیسا بنے گا گھر مرا
کتنے زہر آلود خنجر کر کے پیوست آپ ہیں
خوش ہوئی میری انا اونچا ہوا ہے سر مرا
کیوں نہ اس میں ڈوب جاؤں آج میں پوری طرح
باہیں پھیلائے کھڑا ہے سامنے ساغر مرا
ہوش میں آؤں گا جس دن گھر بلالوں گا تجھے
کون کہتا ہے شبِ ہجراں کھلا ہے در مرا

غزل

اک ایسی بیچ میں دیوار میں اٹھا دوں گا
بڑے سکون سے ماضی تجھے بھلا دوں گا

وہ ایک شخص کہ جو ہے عزیز تر جاں سے
اسے ہی اپنا میں قاتل کبھی بنا دوں گا

نہیں فریب کی منزل سراب آسا بھی
میں ریگ زار میں چشمہ ہوں یہ بتا دوں گا

ہوا کے دوش پہ پتہ نکل گیا ناداں
کوئی جو پوچھے تو اس کا میں کیا پتا دوں گا

نہ جانے کون سی منزل ہے کیسا رستہ ہے
سفر کے نام پہ میں صرف مسکرا دوں گا

مسیح وقت نہیں کوئی چارہ گر بھی نہیں
سلیم تجھ کو بھلا کیا میں بد دعا دوں گا

غزل

کہاں کی حس کہ بدن ریت کے حصار میں تھا
سراب تک نہ جہاں ایسے ریگ زار میں تھا

ملا جو تجھ سے تو آگے نہ بڑھ سکا ورنہ
پڑاؤ ڈالنا کب مجھ کو اس دیار میں تھا

یہ سوچ کیسے بھلا روشنی سے ملتا تو
کرن کا راستہ کوئی نہ تیرے غار میں تھا

یہ مانا پھول کئی رنگ و بو کے لائے تھے
گلاب کوئی مگر کیا تمہارے ہار میں تھا

حدوں میں دشت کی میرا سفر نہ تھا پھر بھی
بدن تمام ہی لپٹا ہوا غبار میں تھا

زمیں کا نام و نشاں تک نہ جو بتائے کبھی
مرا سفینہ اسی بحر بے کنار میں تھا

اُسے جگانے کی خاطر ہی تار چھیڑے تھے
وہ ایک گیت جو سویا ہوا ستار میں تھا

لگا کہ تجھ کو ہر اک شخص جانتا ہے سلیم
گو نام تیرا کسی بھی نہ اشتہار میں تھا

غزل

خزاں گزیدہ زمیں ہوں تو مجھ کو کیا دے گا
ترا گمان ہے تو اک شجر ہرا دے گا

نہ میرے ساتھ چلو میرا ولولہ ہے الگ
سفر کے بعد بھی وہ اک سفر نیا دے گا

ذرا سی تیز کرو آنچ اپنی یادوں کی
فراق و ہجر کا ایک ایک پل مزا دے گا

بھنور بھنور تو سمندر مگر میری ضد ہے
میں ڈوب جاؤں اگر، پار تو لگا دے گا

یہ سبز رت نہ سہی منتظر ہوں میں پھر بھی
کوئی تو آ کے مجھے نقش اک ہرا دے گا

حسین چہرے پہ نظریں سلیم ٹھہراؤ
خیال و فکر کو وہ ریشمی قبا دے گا

غزل

شب شکستہ چراغ بھی گل
کھنڈر نظارہ ہے رنگ کا کل
ہجوم زاغ اب یہاں وہاں ہے
چہک رہے ہیں کہاں پہ بلبل
زبانِ گنگ اب صدا صدا دے
کہ تو بھی ویاکل ہے میں بھی ویاکل
تو وہ کنارہ میں یہ کنارہ
نہیں کوئی درمیان میں پُل
ترنگ نغمہ مٹھاس بولی
کوئی نہ جانے کہ کئیں ہے غل

غزل

دن ڈھلتے ہی ایک پرندہ ڈھونڈے رین بسیرا
حالانکہ اس کے رستے میں ہے اک پیڑ گھنیرا

کب سے دریا خشک پڑا ہے پھر بھی جذبہ دیکھو
جال بچھائے آس لگائے بیٹھے روز مچھیرا

جانے کس ناگن کی کھوج میں نکلا تھا وہ گھر سے
جنگل جنگل گھوم کے بھی ہے خالی ہاتھ سپیرا

ہم بھی کاش بسا لیتے گھر بار کسی بستی میں
ہر سو ریت یہاں ہے یارو دھنس جائے نہ ڈیرا

شب کے صحرائی کی چالوں کا بھرپور تماشا
دور افق پر بیٹھا دیکھے ہے خاموش سویرا

اک جا بیٹھ سلیم اب اللہ اللہ جپتے جاؤ
اب تک تم نے خوب لگایا جوگی والا پھیرا

غزل

کشتی کو بھروسے پہ ہوا کے ہیں بہاؤں
گمنام سمندر کے مزے لوٹ کے آؤں
کھینچی تھیں کبھی سبز لکیریں مرے اندر
وہ کون سا موسم تھا تمہیں کیسے بتاؤں
آئینہ کوئی توڑ کر اپنا ہی گیا ہے
ہیں عکس کئی کون سا ٹکڑا ہیں دکھاؤں
صحرا ہوں مری پیاس بجھائے گا بھلا کون
بادل تو اگر ہے تو ہیں سینے سے لگاؤں
شفاف نظر آنے لگے آنکھ کے شیشے
جی چاہے ذرا آج یہاں گرد اڑاؤں
اب ملنے ملانے کا ہی جھگڑا نہ رہے کچھ
دیوار کوئی بیچ سلیم اپنے اٹھاؤں

غزل

تپتے ہوئے صحرا پہ جو برسے وہ گھٹا دے
یا پھر کسی دریا ہی کو تو اس کا پتا دے
جس اور نظر ڈالو وہی زرد لبادے
منظر کوئی آنکھوں کو مری اب تو ہرا دے
صحرائے لق ودق کی یہ چنگھاڑ ہے شاید
معلوم نہیں اس کے بھلا کیا ہیں ارادے
بھولے سے بھی دہلیز پہ رکھے نہ قدم رات
ہے ایک بھی بتی تو سرِ شام جلا دے
کیا اور سمائیں گے پرندا اپنی نظر میں
دینا ہے تو ہم جیسوں کو شاہین دکھا دے
صدیوں کا سفر دھوپ کی چادر کے تلے ہے
اے کاش یہ پھٹ جائے کوئی ایسی دعا دے
پتھر کے صنم کی یہاں کرتے نہیں پوجا
بت گر انھیں دینا ہو تو سونے کے خدا دے
اس صحنِ گلستاں کو ہوا صاف ذرا کر
جتنے ہیں یہاں پر خس و خاشاک اڑا دے

غزل

ہتھیلی کی لکیروں میں عجب اک آس چہرہ تھا
کہ جب دیکھوں نیا اک روپ میرا وہ دکھاتا تھا
نہیں معلوم اب وہ کون سا آئینہ خانہ تھا
جنوں میں ایک دن میں نے جہاں پتھر اچھالا تھا
سمندر میں ارادوں کے میں کشتی چھوڑ دیتا تھا
عجب دن تھے وہ میرے جب ہواؤں کا نہ پہرا تھا
طنابیں یوں اکھڑ جائیں گی موسم کے بدلتے ہی
پڑاؤ ڈالنے والے کبھی کیا تو نے سوچا تھا
یہاں کی بتیاں گل ہو گئیں ساری تو یہ جانا
اندھیرا بے ضرر ہے خاص قاتل تو اجالا تھا
کھنڈر ہے آج لیکن روشنی تقسیم کرتا ہے
تھکن سے چور سورج کا یہ دل بھی شب بسیرا تھا
اٹل ہے یہ نظام کائنات اپنی جگہ اے دوست
مگر سورج پلٹ آیا تھا کس کا وہ اشارہ تھا
سلیم اپنی ہوا سے ٹھن گئی تھی اور ایسے میں
بھنور تھا اس طرف اور اس طرف میرا سفینہ تھا

غزل

کلیجہ اس شجر کا کبھی تو منھ کو آئے
سحاب اس رہ گزر سے کبھی خالی تو جائے

ہوا کیا مانگ بھرتی زمین بے نوا کی
گزرتے ہیں یہاں سے فقط ذی روح سائے

الگ تھی راہ میری الگ تھی وادیٔ گل
زبس اک فصل ماتم جدائی خار کھائے

زبانِ سرخ لپکے جہاں دو بوند ٹپکے
کوئی آبی بدن کا ذرا شیشہ دکھائے

عمارت کاغذی ہے نظر میں شش جہت ہیں
مکیں کو ہے تسلی خدا اس کو بچائے

نہ لفظوں کو مروڑو نہ بحروں ہی سے کھیلو
غزل سانچے میں رکھو معانی کو چھپائے

غزل

صرف جھولی تہی بھرنے کا بہانا ہے مجھے
کیا صدف کیسے گہر یہ نہ دکھانا ہے مجھے

کیا ضروری ہے کہ شاخیں ہوں گھنیری سب کی
شب بسر کے لیے کافی یہ ٹھکانا ہے مجھے

بے ارادہ ہی سفر ہے کہ دشا کیوں دیکھوں
بادباں ایک نہ اک دن تو گرانا ہے مجھے

آسماں سر پہ جو دیکھو تو مزہ آ جائے
آج کچھ ایسے دھنک رنگ اڑانا ہے مجھے

بھول کر بھی نہ کہانی تری لب پر آئے
جو کھنڈر شکل ہے گرد اس کو بنانا ہے مجھے

سبزہ زاروں کی کرے سیر بھلا کون سلیمؔ
در و دیوار کا سبزہ ہی سہانا ہے مجھے

غزل

راکھ کیا بتائے آنچ آگ کی
بات کر کبھی نہ اپنے تیاگ کی

دودھ آج کل پلا رہا ہوں میں
جانتا ہوں خصلتیں بھی ناگ کی

ساتھ ساتھ تیرے میرا ہے وجود
بات یہ نہیں ہے کوئی لاگ کی

روٹیاں نہ ڈال میرے سامنے
یہ نہ میرے کام کی نہ بھاگ کی

بس میں کر سکے مجھے تسلیم جو
ہے امید خام ایسی باگ کی

غزل

موسم کی ہر اک کاٹ سے گھبرانے لگا ہے
یہ سنگ جو لوگوں کے لیے راہ نما ہے
پانی کا بدن چیر کے جا کچھ تو ملے گا
ساحل پہ کھڑا ہو کے تو کیا سوچ رہا ہے
سورج ہیں کئی سر پہ تیرے اس کا یقیں کر
مت سوچ تو راتوں کے حصاروں میں گھرا ہے
خود تجھ سے الگ ہے تری آواز کا چہرہ
فتنے کا کرشمہ ہے بڑا تو جو بنا ہے
ہلچل کے بنا تم کو پتہ کیسے چلے گا
مضبوط ہے قلعہ کہ گھروندا ہے یہ کیا ہے
کہنے کو شجر پھول و ثمر سے تو لدے ہیں
خائف بھی ہیں اندر سے یہاں تیز ہوا ہے

غزل

ریزہ ریزہ ہو رہا تھا جب زمانے کا ضمیر
آئینہ اک ایسا اترا نور تھا جس کا خمیر

خوف کی تختی پہ اپنا نام پہلے لکھ دیا
کھینچ دی پھر اس کے اوپر روشنی کی اک لکیر

ایک تحفہ خوشبوؤں کا دیکے مجھ کو چل دیا
اب نہیں کچھ یاد وہ تھا کون سی رُت کا سفیر

اس چمن کے پھول سارے کیا مری میراث ہیں
سوچتا ہے رنگ و بو کے دائرے کا اک اسیر

پوچھتا ہے شہر کا سنّاٹا تجھ سے اے سلیم
کیوں چھپا رکھے ہیں اپنی چیخ کے ترکش میں تیر

غزل

کانچ کا سورج جو ٹھہرا آگ برسائے گا کیا
سامنے اس کے کھڑا ہوں مجھ کو پگھلائے گا کیا

کیوں پروئے پھول اس موسم کے میرے ہار میں
آنے والی رُت کے پھولوں کا مزہ آئے گا کیا

مکڑیوں نے بن لیے جالے یہاں پر ہر جگہ
میرا گھر میرا نہیں اب تم کو ٹھہرائیگا کیا

پُل ضروری ہے کنارے دو ملانے کے لیے
بوجھ وہ نازک کسی لمحہ کا سہہ پائیگا کیا

سوچ کر یہ میں نے اپنے گھر میں رکھا ہی نہیں
آئینہ مجھ کو ہی میری شکل دکھلائے گا کیا

اک جزیرہ ہے سمندر میں تنِ تنہا سلیم
یہ زمیں کی وسعتیں پوچھوں تو بتلائیگا کیا

غزل

کچھ سامنے رکھے ہوئے مٹی کے گھڑے ہیں
توڑوں کہ نہ توڑوں یہاں پتھر بھی پڑے ہیں

یہ کیسا اتر آیا ہے موسم مرے گھر میں
آنگن میں اداسی لیے کچھ پیڑ کھڑے ہیں

بھونچال یہاں آیا تھا بس اتنا بتا نے
نایاب دفینے بھی یہاں کب سے پڑے ہیں

کاندھوں پہ بٹھایا تو سمجھنے لگے بچے
اب پوچھنا کیا ہم تو بڑوں سے بھی بڑے ہیں

آواز تری اب تو ہمیشہ ہی سنوں گا
اس فیتے میں انمول ترے بول جڑے ہیں

غزل

کالا سورج دیکھ کے پنچھی چلے گھونسلے اور
بھور بھئے ہے سانجھ کی بیلا ایسی کیسی بھور

ان دیکھی انجانی رت کی چھائی گھٹا گھنگھور
بے سوچے سمجھے ہی جھومے ناچے من کا مور

سونی رات کے آنگن میں ہے سناٹے کا زور
ایسے میں پھر کون مچائے میرے اندر شور

تیری یادوں کے گہنے تھے اب تک میرے پاس
کسے پتہ تھا اس گھر میں بھی گھس آئے گا چور

پیار کا مانجھا دے کر اس کو باندھا تیرا دل
پھر کیوں ٹوٹی ؟ ہم سمجھے تھے ٹوٹے گی نہ ڈور

غزل

راستے اس شہر کے ہیں کیسے بل کھائے ہوئے
پھر بھی ہم کو دیکھئے ان کو ہیں اپنائے ہوئے

کھیل نازک ہے بہت تم سوچ کر رکھنا قدم
کانچ کے سپنے وہ آنکھوں میں ہیں بکھرائے ہوئے

رات کی وادی میں اترا تو نظر آیا مجھے
روشنی کا ایک سایہ ہاتھ پھیلائے ہوئے

تیرے چہرے کے ہر اک خط کو دکھا سکتا ہوں میں
گو مری دیوار کے شیشے ہیں دھندلائے ہوئے

کیوں رکھے ہیں طاق میں گلدان کے ٹکڑے ابھی
پھینک دو جس طرح پھینکے پھول مرجھائے ہوئے

آنکھ ہے گرداب کی اب تک ہمارے سامنے
یوں تو ساحل پر زمانہ ہو گیا آئے ہوئے

ہم نے یہ مانا بگولے بھی اٹھیں گے دشت میں
ہم بھی لیکن آج بادل بن کے ہیں چھائے ہوئے

پیڑ یہ تو پھول پھل والے نہیں پھر کیوں سلیم
ہیں ہوا کی چال سے اس طرح گھبرائے ہوئے

غزل

اب تک تم نے خوب اڑائی ہے اپنے جسموں کی خاک
آج گھٹا بن جاؤ کھل کر برسو کر دو دھرتی پاک

شب جنگل میں رہ کر اپنی آنکھیں کیوں چمکاتے ہو
سورج سے بھی آنکھ ملاؤ تو میں جانوں ہو بے باک

اک بادل ہے جس کے قبضہ میں ہے دھرتی کی دولت
اور اک صحرا، ریت، بگولے، پیاس فقط اس کی املاک

گھور اندھیری رات کی چادر آ ڈھل کر کھینچیں ہم
کیا جانے اس نے بھی اندر پہنی ہو اجلی پوشاک

ایک یہی تو سرمایہ ہے جس پہ وہ کرتا ہے ناز
کیا گزرے گی کوزہ گر پہ مت توڑو تم اس کا چاک

پتھر کانٹوں پر چل کر بھی آئیں گے ہم تیرے پاس
پروا کیا ہے ہوتے ہیں تو ہو جانے دو تلوے چاک

غزل

پتنگ اپنی فلک پر دیکھ کر ہر کوئی نازاں ہے
دعا موسم کو دینا چاہیئے یہ اس کا احساں ہے
صدف صورت نظر آتے ہیں چہرے تو بہت لیکن
نہیں معلوم کہ انمول موتی کس میں پنہاں ہے
یہ مانا زرد پتے شاخ سے اب تک لٹکتے ہیں
مگر انجام سے واقف ہر اک اندر سے لرزاں ہے
اگر ڈھ جائے بھی میری عمارت مجھ کو کیا پرواہ
کہ ملبے سے کبھی تو آئے گا باہر جو ساماں ہے
خرابے سے چلا تھا شہر سے آگے نکل آیا
بہت لمبی کہانی ہے مگر اک صفر عنواں ہے
سمجھ کر تم سمندر میں اتارو اپنی کشتی کو
ہوا خاموش ہے اس کی مگر مٹھی میں طوفاں ہے
اچھالو سنگ تم اپنے ہی سر پر اپنے ہاتھوں سے
ہے جتنا کھیل یہ مشکل سلیم اتنا ہی آساں ہے

غزل

گھپ اندھیرے راستوں میں ڈھونڈھنے دیپک گیا
اس لگن میں میں کہاں تک اور کس حد تک گیا
چار سو تھی گرد اس میں دوش تیرا بھی نہ تھا
جس جگہ جانا نہ تھا خود میں وہاں بے شک گیا
میں تھا میری تھی مسافت دشت کی لیکن سحاب
تجھ کو یہ کیا ہو گیا تو دے کے کیوں دستک گیا
ریت دل تھا اور بدن تھا برف پتھر آنکھ تھی
وقت اس حالت میں لے کر کیوں ترے در تک گیا
پیڑ جلنے ہیں یہاں پر سب ثمر در ہیں مگر
اس سمٹے میری نظر اس پھل پہ ہے جو پک گیا
روح کے اک اک ورق کا عکس لگتا ہے مجھے
سامنے وہ رکھ کے میرے کیسی یہ پستک گیا
کس سے پوچھیں ہم یہاں کوئی نہیں جو دے جواب
روشنی گل ہو گئی یا آنکھ کا دیپک گیا
یہ تناور پیڑ بھی کیا کھوکھلا ہو جائے گا
سوچتا ہوں جب سے اندر کا میرے بالک گیا
ہے اٹل ہر اک چٹان اپنی جگہ پر اے سلیم
لیتے لیتے کروٹیں لاوا بھی اندر تھک گیا

غزل

ڈوبتا سورج دکھا کر کیا ہمیں منظر گیا
روشنی کی کھڑکیاں ہی بند جیسے کر گیا

اب کہاں جائیں کدھر جائیں ارادہ کیا کریں
جو پتہ منزل کا دیتا تھا وہی پتھر گیا

کیا پتہ یہ اس قدر ویران ہے سنسان ہے
آنکھ کے صحرا میں رکھتے ہی قدم وہ ڈر گیا

گھپ اندھیرا تھا دشائیں گم تھیں جانے کون پھر
روشنی کی ایک ریکھا کھینچ کر اندر گیا

یہ مری تصویر ہے ہر خط نمایاں ہے مگر
رنگ بھرنے والا اس میں رنگ تیرا بھر گیا

کچھ نظر آتا نہیں کس سمت کیا ہے اب سلیم
دھول کیسی یہ اڑا کر خوف کا لشکر گیا

غزل

خالی خالی ذہن کی جھولی ایک نہ اس میں موتی ہے
کیا لکھوں کیا تم کو سناؤں فکر کی دیوی سوتی ہے

سندرتا نے پگ میں دیکھو کیسی ڈور یہ باندھی ہے
جیسا ناچ نچائے ناچو ورنہ بیری ہوتی ہے

آشا کے منجھدھار میں ہم نے دل کی ناؤ اتاری ہے
دیکھیں پار لگاتی ہے کہ قسمت اسے ڈبوتی ہے

بھولی بسری یادوں کے آنگن میں پاؤں رکھتے ہی
تیری صورت بکھرے موتی اک دھاگے میں پروتی ہے

نینن بان کو دل پہ لے لے گھائل ہو جامت گھبرا
چڑھتا سورج ڈھل جائے گا کیوں یہ گھڑیاں کھوتی ہے

دھن کی لالچ میں تو پگلا دیس عرب میں جا بیٹھا
عید و خوشی کے موقع پر برہن چپ بیٹھی روتی ہے

غزل

روح کی تسکین ہو یا جان کا آزار ہو
بند مٹھی میں نہ جانے پھول ہو یا خار ہو
سایۂ دیوار ہے لیکن نہ ٹھہروں گا یہاں
کیا بھروسہ یہ بھی کوئی ریت کی دیوار ہو
چاندنی راتوں میں بھی صحرا کا چہرہ دیکھ لو
جانے کتنے سورجوں کا سر پہ اس کے بار ہو
دے رہا ہوں آج میں ترتیب جن اوراق کو
کیا عجب وہ آنے والے دور کا اخبار ہو
روشنی کے نام سے تو مسکرا دیتا ہے کیوں
یہ تو اس کا کام ہے جو صبح کا بیمار ہو
ایسا پربت جس کی عظمت اس کی چوٹی ہو تو ہو
میرے وہ کس کام کا جس میں نہ کوئی غار ہو
پانیوں کی چاہ میں جانے کہاں تک آ گئے
اب سلیم اپنی دعا بس یہ ہے بیڑا پار ہو

غزل

چھپی ہیں کرچیاں بھی کانچ کے کھلونے ہیں
یہ سوچ کر ہی اسے رکھ دیا ہے کونے ہیں
ہوا چلے گی تو ہر سمت پھیل جاؤں گا
اگرچہ ڈھیر ہوں مٹی کا ایک کونے ہیں
یہ جان لو کہ سمندر کی تہہ میں کیا شئے ہے
مزہ ملے گا تمہیں کشتیاں ڈبوتے ہیں
ہٹا کے چہرے سے گرد و غبار کیا کیجے
ہے تیرے شہر کی رسوائی ان کے دھوتے ہیں
مرے وجود کا پتھر رہے گا کیا سالم
بچا ہی کیا ہے کھنڈر کے غبار ہونے ہیں
سلیمؔ جھولی میں موتی ہیں کتنی راتوں کے
بکھر نہ جائیں کرن در کرن پروتے ہیں

غزل

تم بھی چپ اور ہم خاموش
جانے اس میں کس کا دوش

پلکیں اپنی بھیگ گئیں
خالی ہے اب دل کا کوش

لوگ ہیں سارے ایک سمان
دنیا میں کس کو سنتوش

ہر چہرے پہ معصومی!
کس کو ہم کہتے نردوش

دل جو میرا بدلے تو
دھارن کرلوں اجلے پوش

غزل

پی لیے میں نے سمندر کتنے
پھر بھی صحرا مرے اندر کتنے

وہ فقط میری انا ہی تو تھی
گھر پہ آئے مرے پتھر کتنے

ایک ہی رنگ دکھایا تھا ابھی
رنگ ابھرے پسِ منظر کتنے

جھک کے ملتے ہوئے پستہ قد سے
ہم نے دیکھے ہیں قدآور کتنے

نقش میرا نہ کوئی بن پایا
یوں تراشے گئے پتھر کتنے

لوگ کہتے ہیں مگر سوچ سلیم
دشت کے ہیں یہاں خوگر کتنے

غزل

منظروں کا یہ نگر دیکھو دھواں ہونے لگا
ڈوبتی آنکھوں کا ساگر بیکراں ہونے لگا

جان لیوا تھا پرانی داستاں کا ہر ورق
تجھ سے مل کر مندمل ہر اک نشاں ہونے لگا

چلچلاتی دھوپ اندر جب مزہ دینے لگی
قطرہ قطرہ پر سمندر کا گماں ہونے لگا

ایک ذرہ ریت اور پھر ریت سے بنکر غبار
اس طرح پھیلا کہ سر پر آسماں ہونے لگا

کیا سمجھ کر پہلے مجھ کو غرق کرنے پر تلا
وقت میری ناؤ کا پھر بادباں ہونے لگا

رقص ہیں رنگوں کا موسم اور میں چپ چاپ سا
کیا بتاؤں کیا تماشا درمیاں ہونے لگا

دشتِ شب کا یہ سفر مجھ میں اُتر آیا سلیم
سایا سایا ساعتوں کا بے اماں ہونے لگا

غزل

نہ کوئی ڈر نہ اب کوئی خطر ہے
بڑا ہی مشکلوں کا یہ سفر ہے
لبالب ہے لہو کا تیز دریا
سمندر کی طرف شاید نظر ہے
نہ روکو ان امڈتے بادلوں کو
کوئی پیاسا کوئی سوکھا شجر ہے
سمجھتے تھے جسے سب کا مسیحا
یہی وہ شخص ہے جو دار پر ہے
یونہی بس کھیلتے تھے پتھروں سے
خبر کیا تھی یہاں شیشے کا گھر ہے
سبھی اس دور میں گم ہو گئے ہیں
کسی کو بھی کہاں اپنی خبر ہے؟
سلیم اپنا کہاں کوئی بسیرا؟
نگر یہ آج تو کل وہ نگر ہے

غزل

وہ شخص مقابل مرے آگے جو کھڑا ہے
جو ساتھ مرے جی کے مرا مر کے جیا ہے

تحریر بلا کی ہے غضب اس میں لکھا ہے
بوسیدہ ورق مجھ کو جو رستہ میں ملا ہے

دامن پہ گرے خون کے چھینٹے تو لگا یوں
جیسے کوئی گردن پہ مری بیٹھ گیا ہے

یہ وقت ہے اس وقت کے ہاتھوں سے بچا کون
کہنے کو ابھی وقت سے تو کھیل رہا ہے

مٹنے کو تو مٹ جاتا ہے ہر نقش یہاں پر
لیکن ترے مٹنے کا بھی انداز جدا ہے

غزل

چہرہ چہرہ ڈوبتا سورج دوپہری کی بات کہاں
ہر دل میں اندھیارا چھائے پونم کی وہ رات کہاں

جھوٹی رونق اوڑھ کے نکلے سب اندر خالی خالی
جسموں کو دیکھو تو کھنڈر ہیں وہ مستوں کی ذات کہاں

لوگوں کا سیلاب ہے لیکن جان نہیں ہے شہروں میں
کہنے کو سب ساتھ ہیں لیکن پھر بھی کوئی ساتھ کہاں

آشاؤں کے درپن درپن چھوٹ گئے ان ہاتھوں سے
ہر پل بوجھ نراشاؤں کا تھامیں ایسے ہاتھ کہاں

چاروں اور اندھیرا گھپ ہے کون پتہ دے سمتوں کا
سب کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں پھوٹے گی پربھات کہاں

غزل

صحرا مرے اندر یہ اتر آیا کدھر سے
بادل کوئی چپکے سے گزر جائے نہ سر سے

مانا کہ ابھی آنکھ ملاتے ہو بھنور سے
کشتی بھی ذرا دیکھ لو تم میری نظر سے

پوچھو نہ مرا حال فقط دیکھ لو اتنا
چہرے پہ جمی گرد میں لایا ہوں سفر سے

در آئی صدا مجھ میں شکستہ کسی پل کی
حالانکہ نہ رشتہ ہے کوئی میرا کھنڈر سے

غزل

کم کم ہے دیوار کا سایا
تو بے کار یہاں پر آیا
پیسہ پیسہ تو چلّایا
کچھ بھی تیرے ہاتھ نہ آیا
بھوکی ننگی راج سیاست
کس نے کیا کھویا کیا پایا
تازہ پھولوں کے گلشن میں
کیوں آیا کاہے مرجھایا
بولو بولو کچھ تو بولو
جو بولا وہ نام کمایا
دھن دولت کی دنیا میں ہے
خاک یہ شعروں کا سرمایا

بادل سر پر آیا لیکن
برس نہ پایا بس ترسایا
جنگل دریا سے مل کر بھی
سورج حدّت چھوڑ نہ پایا
دلہن برہن پھر بیراگن
تونے کیسا ساتھ نبھایا

غزل

(تمام مطلعوں پر مشتمل)

تمنا ہی رہی کوئی تو پڑھتا
ہماری آتما کی روپ ریکھا

عجب محرومیوں کا ہے اندھیرا
کہ مجھ سے دور ہے میرا ہی سایا

مجھے باہر سے تو سب نے ہے دیکھا
مگر تو تو مرے اندر اترتا

ہر اک رستہ پہ ہر منزل پہ تیرا
یہاں پر کون ہے جو ساتھ دے گا

لہو کے زہر میں اے کاش پاتا
گلوں کی چاشنی کا ایک قطرہ

اسی صورت سے گر مجھ کو جلایا
نشاں بھی مل نہ پائے گا چتا کا

مجھے اپنا کے بھی یوں دور رکھا
کہ جیسے فاصلہ دو اجنبی کا
خوشی کا دور کتنی دیر رہتا
کہ وہ بھی تھا کوئی جھونکا ہوا کا
کسی کا درد کوئی بانٹتا کیا
سبھی کو اپنا اپنا غم ہے پیارا
مجھے افسوس ہے تو صرف اتنا
یہاں کوئی بھی دُکھ میرے نہ سمجھا
سلیم اس کو کہیں پر پھینک دوں گا
اٹھاؤں گا کہاں تک اپنا لاشہ

غزل

(تمام مطلعوں پر مشتمل)

قطرہ قطرہ دریا دریا بن بیٹھا تو کیا بھلا تھا
موجِ رواں جب بن بیٹھا تو ساحل ساحل ٹکرایا تھا
شیشہ شیشہ رستہ رستہ رکھ رکھ کرچیں نے کچلا تھا
تو نے بھی کیا یاد دلایا اس کو تو میں بھول چکا تھا
تم کیا جانو سب سے پہلے آنکھوں سے میں نے چوما تھا
پھر جب تم نے آنکھ ملائی آگے بڑھ کر تم سے ملا تھا
سوکھے کھیت اور پیلے جنگل ہریالی کو کیا ترسا تھا
اب کے برس پت جھڑ کا موسم جانے کیوں اتنا لمبا تھا
سانسیں پھول رہی تھیں میری دل میں بھی اک کھٹکا سا تھا
اس سے پہلے اس کے آگے میں نہ تو اتنا گھبرایا تھا
تو ہے کیوں چپ چاپ بتا کچھ دوش آخر میرا کتنا تھا
باہنوں میں بھر کر ہی تجھ کو دل میں تیرے میں اترا تھا
ریکھاؤں میں ہاتھ کی میرے عکس کوئی دھندلا دھندلا تھا
تجھ کو دیکھا تو پہچانا چھپا ہوا تیرا چہرا تھا

کیا میں تم سے نہ کہتا تھا وہ تو بس ایسا ویسا تھا
تم نے اس کی بات میں آکر خود اپنا سب کچھ کھویا تھا
بھیڑ دکن کی محفل میں کیوں ہے اتنی میں سوچ رہا تھا
میں ہوں شاعر، میں ہوں شاعر، جس کو دیکھو وہ کہتا تھا
تم کو اپنی رام کہانی ایک مسافر سنا رہا تھا
دیکھنے والوں نے یہ دیکھا تم ہنستے تھے وہ روتا تھا
آنکھ کے اسود اور ابیض کے بیچ میں ہلکا سا پردا تھا
کیا تھا اس کے دل میں کیا تھا جب ملتا ہنس کر ملتا تھا
چہرہ چہرہ عکس دکھاتا ایسا میرا آئینہ تھا
اندر کے چہرے کے عادی لوگوں میں رہ کر لوٹا تھا
بھیگی بھیگی رت تھی لیکن اندر کا موسم جلتا تھا
تجھ کو پاتا پھر کھو دیتا کتنا مہنگا یہ سودا تھا

صفر کا اعجاز اپنا منہ چھپا کر سو گیا
دل مرا مرجھا گیا تو ذہن خالی ہو گیا
شاعری روٹھی تو مجھ سے روٹھی ساری کائنات
کب، کہاں، کیوں کر نہ جانے میرا شاعر کھو گیا!

ختم شد

◇ شاہد پبلی کیشنز کی دوسری مطبوعات ◇

میر تقی میر عالمی سیمینار

مرتب : اطہر رضوی : کل صفحات: ۲۷۱، قیمت: ۳۰۰ روپے

غالب اکیڈمی ٹورانٹو کے بانی و صدر جناب اطہر رضوی نے ٹورانٹو میں عظیم الشان پیمانے پر خدائے سخن میر تقی میر سیمینار کا انعقاد کیا۔ اس میں پڑھے جانے والے مقالات کو انھوں نے کتابی صورت میں شائع کیا۔

اس کتاب میں جن حضرات کے مقالے شامل ہیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر آفاق احمد، پروفیسر منظر ایوبی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر نعیم چودھری، ڈاکٹر خالد سہیل، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اکرام بریلوی، ناصر کاظمی (مرحوم) تسلیم الٰہی زلفی، ڈاکٹر ظل ہما، ڈاکٹر شاہد حسین۔

جنوب مغربی ایشیا میں

ہمارا تہذیبی ورثہ

مصنّف : ڈاکٹر تنویر احمد علوی : کل صفحات ۲۶۰، قیمت: ۲۵۰ روپے

یہ کتاب ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی گرانقدر تصنیف ہے۔ اور ان کے وسیع تر تاریخی اور تہذیبی مطالعہ کا ثمرہ ہے۔ ارتقائے تہذیب، علامی تہذیب، عرب تمدن، ہندوستانی روایت، مغربی قوموں کی آمد اور یگانگت کے تقاضے عنوانات ابواب کو تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کے صفحات اس امر کے گواہ ہیں کہ ہماری تہذیبی تاریخ کے سرچشمہ کس طرح ایک دوسرے کی روش و کشش کے آئینہ دار ہیں۔ اور فکر و نظر کے لیے ایک روشن نقطۂ اتحاد کا درجہ رکھتے ہیں۔

159 + 160

قصّہ مہرافروز و دلبر

(تنقیدی و تہذیبی تجزیہ)

مصنّف: ڈاکٹر شاہد حسین، کل صفحات: ۲۵۲، قیمت: ۲۵۰۔

ڈاکٹر شاہد حسین کی تحقیقی تصنیف ہے، اس اہم مخطوطے کو پہلی بار اپنے فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اب سے ۳۵ سال پہلے مرتب کرکے شائع کیا تھا۔ جو ہماری ادبیات میں ایک گرانقدر اضافہ کہا جا سکتا ہے۔

صادق الخیری (حیات اور ادبی خدمات)

مصنفہ: ڈاکٹر ظلِّ ہما، کل صفحات: ۳۰۴، قیمت: ۲۵۰ روپے۔

دہلی کے معروف و ممتاز ادیب ترجمہ نگار اور انشا پرداز صادق الخیری کی شخصیت اور ان کے فن پر ڈاکٹر ظلِ ہما کی یہ وہ کتاب ہے جسے اس مرحوم ادیب کی زندگی پر پہلی دستاویزی تحریر اور تنقید کہا جا سکتا ہے۔

دہلی میں اردو افسانہ

(۱۹۰۰ سے ۱۹۴۷ء)

مصنفہ: ڈاکٹر ظلِ ہما، کل صفحات: ۳۷۴، قیمت: ۲۰۰ روپے

ڈاکٹر ظلِ ہما کی یہ تصنیف دہلی میں اردو افسانے کی تنقید و تاریخ پر ایک اہم ادبی دستاویزی کتاب ہے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے آغاز سے ۱۹۴۷ء تک دہلوی افسانے کا تنقیدی و تاریخی جائزہ لیا ہے یہ جائزہ نہ صرف یہ کہ دہلی میں اردو افسانے کی ابتدا و ارتقا پر ایک اہم جائزہ ہے بلکہ مجموعی حیثیت سے اردو افسانے کے مطالعہ کے سلسلہ میں ایک ضروری کتاب ہے۔